

یادِ ویوِ غالب

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی



قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

یاد و بودِ غالب

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی



قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔ اے آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق فطرت اور شعور کا ہے۔ ان دو خداوار صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے عقلی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تفسیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر و رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سائنس اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے صفحہ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قوی کو نسل برائے فرد و اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں کبھی جانے والی بولی جانے والی اور چڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب

سادہ دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بورڈ نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کیں ہیں۔ اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے اب ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا پروگرام شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات غور سے نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خالی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائریکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، انسٹی وسائٹ، سکس، بھد، نئی دہلی

فہرست

۹	غالب کی عظمت	-۱ ۱
۱۷	غالب اور بے صبر	-۱ ۳
۲۸	غالب اور آزدہ	-۱ ۳
۳۷	غالب کی شخصیت اور شاعری	-۱ ۳
	میں	
	ترکی، ایرانی عناصر	
۵۶	غالب کا مقدمہ پیش	-۱ ۵
۷۱	غالب کے چند غیر مطبوعہ فارسی رقعات	-۱ ۶
	حضرت غمگین کے ساتھ	
۸۱	غالب کا سنگ شعر	-۱ ۷
۹۶	معرکہ غالب و حامیان قتیل	-۱ ۸
	ایرانی، ہندی نزاع کی روشنی میں	
۱۱۵	غالب کی دلی	-۱ ۹

غالب کی عظمت

آج کا دن ہماری تاریخ ادب میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اس روز قلم سخن کے تاجدار مرزا اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہی نہیں ہوا بلکہ پورے ایک دور ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا یہ دور عبادت ہے فیضی اور رحیم کی شاعری سے عبدالصمد کی مصوری سے اور سیکری اور تاج محل کی صناعتی اور خوبصورتی سے، مرزا غالب اس محفل کی آخری شمع تھے، لیکن وہ ایک دور کے خاتمہ ہی نہیں، ایک نئے دور کے پیش رو بھی ہیں۔ ادب میں جو نئی بنیادیں انھوں نے قائم کیں، جدید نثر اور جدید شاعری کا ایرانِ ربیع اسی پر تیار کیا گیا ہے۔

مرزا غالب نے جس وقت مہوش کی آنکھ کھولی، مغلیہ سلطنت کی شمع ٹٹا رہی تھی، لارڈ دیک کی فوجیں دلی تک پہنچ گئی تھیں، انگریزی نظم و نسق قائم ہو چکا تھا اور شہنشاہِ عالم اور عالمیان کی حکومت قلعہ سلطنت تک رہ گئی تھی، پرانا نظام کمزور اور بے دست ہو گیا تھا اور نئے کی گرفت دن بدن مضبوط ہوتی جاتی تھی، لیکن ابھی قدیم نظام حیات کی وکھٹی کم نہ ہوئی تھی بلکہ تبدیل شدہ حالات نے اس محبت کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ آویزش اور پیکار تھا جو اسماعیل شہید سے شروع ہو کر غدر پر ختم ہوا، غدر سے مرزا غالب کی وفات تک پرانا نظام حیات درہم برہم تو ہوتا رہا لیکن نیا درجو میں نہیں آیا، پرانی قدریں ضائع ہو کر ختم تو ہونے لگیں لیکن نئی

وجود میں نہیں آئیں، اس وقت نقشِ جاوہر پیدا تھا اور زندگی سنسزل و مہل سے بے نیاز تھی۔

اس شکست اور اضطراب کے زمانے میں، جب موجِ خوں ہمارے سر سے گذر رہی تھی، مرزا غالب نے دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا کیا انھوں نے زندگی کی تکلیفوں پر رنجیدہ ہونے کے بجائے اس کا ایک حوصلہ اور ایک ہمت عطا کی، انھوں نے تیرگیِ شام کو نورِ سحر قرار دیا اور اس طرح ہمیں ظلمت کے برداشت کرنے کا اہل بنا دیا۔

غالب کی پرورش نہایت شاندار ماحول میں ہوئی تھی، جہاں عیشِ امروز کے سارے وسائل و ذرائع موجود تھے یعنی شاہ و شمع و سہ و قمار، لیکن یہ فضا مادی ترقیوں کے لیے ساڈا گار نہیں تھی، اب سرشکری کا موقع نہیں تھا، صرف سخن گسری کا موقع تھا، اس لیے انھوں نے اپنی آرزوؤں کے پورا کرنے کے لیے شعر و سخن کا راستہ اختیار کیا جس کا ذوق وہ ازل سے لائے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں "آئینہ زودون و صورت معنی نمودن نیز کار نمایاں است" یہی وجہ ہے کہ تورانیوں کا علم ان کے قلم میں تبدیل ہو گیا ہے، اس قلم میں تلوار کی سی تیزی اور برش بھی آگئی ہے جس کی آزادی اور حرأت کے ساتھ مولانا اسماعیل شہید نے اپنی اصلاحی تحریک شروع کی تھی، اور رسوم و معاشرت میں تقلید کی بُرائی، اسی آزادی کے ساتھ غالب نے فنِ اخت اور فنِ شعر گوئی میں استادوں پر آڈوانہ بکتہ چینی کی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں "ہر برائی نگیر صراطِ مستقیم نہیں ہے" اور اگلے جو کچھ کہہ گئے ہیں، وہ پوری طرح سند نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ مرزا غالب نے شعر و ادب میں ماضی کے سرمایے سے قطع نظر نہیں کیا، حال کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا اور مستقبل کے لیے دعوتِ پیدائی، عبدالحق صاحب نے صحیح فرمایا ہے کہ اگر غالب نہ ہوتے تو حانی اور اقبال بھی نہ ہوتے۔ یونان کے دیوتا کی طرح ان کا ایک رخ ماضی کی طرف ہے اور دوسرا مستقبل کی طرف۔ غالب غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے، ان کی عظمت کا راز ان کی زنگارچی، ان کی دیکش انفرادیت، ان کی انسان دوستی اور ان کی آفاقیت میں پوشیدہ ہے۔ وہ

بڑے شاعر ہوتے ہوئے بھی ایک ہمدرد انسان تھے، جسمانی، تعلقاتی، بشریت
خوبیاں بھی ہیں اور خرابیاں بھی، انھوں نے کبھی اپنی شخصیت پر تہ بہ تہ نقاب نہیں
ڈالے اور پردے کے نقش و نگار کو حقیقت باور نہیں کرایا، وہ جیسے ہیں اپنے آپ کو
ظاہر کرنے میں، یہی بلیک صداقت، جذبہ رندی اور بنجیدہ ظرافت اوداد ادب کا
سب سے بڑا سرمایہ ہے، انھوں نے نئے نظام اور نئے زمانے کی اس وقت تاہد کی
جب سرسید کو بھی اس کی جرات نہیں تھی، انھوں نے قلیل، برہان قاطع اور نواب
کلب علی خاں کے جوابات اسی طرح دیے، جس طرح ترک اور تورانی لڑتے ہیں،
کسی جگہ انھوں نے اپنی انفرادیت کو مجروح ہونے نہیں دیا۔

اس پُر آشوب زمانے میں خود مرزا کی زندگی بڑی پُر آشوب گزری، وہ اگرہ
کے خم کہ دنیا ز سے نکل کر دی آئے تو یہاں شاعر اور، سے منزہ آرا ہوئے، انھوں نے
قدرت کی ساقی، تحریک کو مانا لیکن اس کو ٹیچمانہ نظر بھی دی، کلکتہ گئے تو وہاں قلیل کے
حلقہ جگوشوں سے برسر پیکار ہوئے اوداد اس ایرانی ہندی نزاع میں کود پڑے، جو
قیس اور عرفی اور شیخ علی حوٹیں اور خان آرزو کے زمانے سے بہاری تھی، مرزا نے
اس میں بھی سرگرم حصہ لیا اور بعض ایرانیوں سے خراج تحسین ماحول کیا، پھر ان کی
پنشن کا قصہ اٹھ کھڑا ہوا جس میں تیس برس تک الجھے رہے۔ یہ صرف روپیہ کا
معاملہ نہیں تھا، خانداہنی حق اور وجاہت کا بھی سوال تھا۔ انھوں نے انگریزوں کی
خدمت میں عزتیاں بھیجیں اور حکام کو خوش کرنے کی بیش از بیش کوشش کی لیکن
یہاں بھی سوال شنا کوئی اور مدح گسٹری سے زیادہ، جیغہ دہرے پیچ و مالاملے مردار پر کا
تھا یا دوبار لمبر اور غلت کا۔

اس وقت وہ تمام روشنیاں جن سے غفلت کہ دہیات میں روشنی تھی، ایک ایک
کر کے گل ہو رہی تھیں، وہ تمام قدریں جو مرزا کو بے حد عزیز تھیں ایک ایک کر کے ہندیم
اور سارہود ہی تھیں لیکن ان کے کلام میں فریاد اور بغاوت پیدا نہیں ہو سکی، اور یہ
اولیٰ بات نہیں ہے۔ اگر گلشن ہند کی روایت صحیح ہے تو میر تقی میر کو تین سو روپے ماہوار
ملتے رہے، لیکن مرزا غالب کی "ذاتی" مارت، ہمیشہ ایک اختلافی مسئلہ رہی اور جب

اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کا وقت آیا تو اس کی "مالیت" باسٹور و پیر آئندہ آنے سے زیادہ نہ نکلی۔ اس کے باوجود ان کے کلام میں وہ "کلیت اور مرثیت" پیدا نہ ہو سکی کہ وہ آہ جگر گداز اور نالہ و دل خواش کو حاصل زندگی سمجھنے لگتے۔

مرزا کی شخصیت میں جو چیز غیر معمولی کشش اور دلآویزی نکلتی ہے وہ ان کی بشریت ہے اور اس پر فخر و ناز ہے۔ ان کے کلام میں عام انسانی مسائل اور ابھنوں کا بیان ہے اور انہیں اس کے اظہار میں مطلق پاک نہیں تھا کہ وہ عام انسانی کمزوریوں سے بالاتر نہیں تھے۔ اکرام نے سرواثر لے کے ایک قول شکسپیئر کے متعلق نقل کیا ہے "وہ کم یاب ترین چیز تھا، یعنی ایک پورا انسان" غالب بھی کہتے ہیں،

خوئے آدم دارم، آدم زادہ دارم

سعدی کی طرح ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کی ہوش مندی اور دنیا داری ہے جو اس دنیا کے بسنے والوں کو بہت عزیز ہے۔ اس آئینہ میں وہ اپنے ہی خطا و خال دیکھتے ہیں اور ان کے دل کی داستانیں ان کو اپنی ہی سرگذشت کا لطف ملتا ہے۔ غالب کی شخصیت صرف پر شکوہ اور لائق احترام ہی نہیں بلکہ وہ ہمارے "ادب کی سب سے خوش صحبت ہستی" سے "آپ جس رنگ اور لباس میں بھی دیاں جائیں گے وہ آپ کو پہچان لے گی، آپ کے درد و دل سے واقف ہوگی اور آپ کو تسکین اور آسودگی کا سامان بہم پہنچائے گی۔ اسی لیے مجھوری نے لکھا تھا کہ لوح سے تمت تک نکل سے تو صفحے ہیں لیکن کون سا نغمہ ہے جو یہاں نہیں ہے۔ اس کی وجہ صحت مرزا کی رنگارنگی اور بے تلوں شخصیت ہے۔

بعض نقادوں نے مرزا کو ولی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے شیطان، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف ایک انسان تھا جو بشری کمزوریوں پر پردہ نہیں ڈالتا بلکہ انہی نمایاں قسم کا خالی ہے۔

غالب سے پہلے آدہ شاعری کے پاس جذبات تھے، احساسات تھے، زبان و بیان کے کرشمے تھے لیکن وہ حسین اور خوش ذہانت نہیں تھی جو ہیکر افغانا میں روح چھوٹک

دین ہے، یہ مرزا کا عطیہ ہے اور اس پر اردو بتنا بھی غر کرے، کم ہے۔ وہ اپنے تدریم سراپے سے واقف تھے لیکن اس کی ہر رسم اور فید کے پابند نہیں تھے، اسی لیے ان کا، شاعر، انصوں و انسانہ نہیں ہے۔ اس میں نفسِ گرم کی آمیزش ہے، خونِ جگر کا، نو ہے۔ انھوں نے ہمیں نئے نئے خیالات دیئے، ان کے ادا کرنے کا یا کیا نیا اسلوب دیا اور سوچنے کے لیے حکیمانہ انداز، اور جانچنے کے لیے تنقیدی شعور۔ اس میں مغلِ مسلم کی شگفتگی ہے، اس کا پر معنی اختصار ہے، اس کا حرکت، پاکپن ہے۔ یہ انداز و اسلوب حال اور مستقبل دونوں کے لیے اہم ہے۔ غالب نے غزل اور قصیدے کی خارجی قبا وہی رکھ رکھی ہے جو پہلے تھی، لیکن ان میں ایک اندرونی انقلاب ضرور پیدا کر دیا ہے۔ ناسخ و نصیر کی دنیا ان تبدیلیوں کی اہمیت کو اچھی طرح نہ سمجھ پائی اور غالب کو یہ کہنا پڑا :

مرے دعوے پر یہ جوت ہے کہ مشہور نہیں!

غالب نے نظریہ حسن و عشق کی تعمیر میں ان کی وراثت، ان کی شخصیت اور ان کے نسل و خاندان کو بڑا دخل ہے۔ وہ محبوب کے وصل کو بہار و تماشائے گلستانِ حیات سمجھتے ہیں اور بابر کی طرح پیشِ امر و کوثر زندگی کے لیے ضروری۔ انھوں نے جن سچائیوں کا ذکر کیا ہے وہ ذہنی تجربہ نہیں بلکہ تجربہ اور جذبے سے بھرپور ہونے کے باعث مجازی مادہ اور انسانی ہیں۔

غالب کی سیرت اور ان کا کردار مثالی نہیں ہے، ان میں بہت سی خامیاں ہیں لیکن یہ خامیاں زیادہ تر ان کے جھٹنے اور ان کے زمانے کی خامیاں ہیں، تاہم ان کی ذکاوت کا یہ کمال معمولی نہیں ہے کہ وہ اپنے ماحول کی خرابیوں سے باخبر نہیں تھے اور تخریب کے بعد تعمیر ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے یہاں جو مغربی تمدن کا، برکتوں کا احساس اور انگریزوں کے علم و آئین اور داد و دانش کا، تعریفِ مطلق ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے جھٹنے اور ماحول سے بلند ہو کر بھی معاملات پر نظر ڈال سکتے تھے۔ غالب نے کلکتہ میں قیام کیا تھا جو اس وقت نئی تہذیب کا گہوارہ تھا۔ اگر وہ کے بعد دہلی ان کا وطن تھا جس کو پرانی تہذیب کی علامت کہنا چاہیے لیکن یہاں تدریم وئی کالج نے سائنسی علوم

کو اہمیت دے کر ایک نئی شمش چہت پر برآمد کر دی تھی۔ غائب کے ذہن کے نقشہ نگار وہ اصل ان ہی دونوں جگہوں سے مستعار ہیں۔

مرزا غالب نے اردو شاعری ہی کو نیا رنگ و آہنگ نہیں دیا جدید اردو شاعری بڑا دھبی اپنے باہر کتب ہاتھوں سے قائم کی۔ ان کے خطوں میں، ان کی شخصیت اور فصیح عصر پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ وہی گفتگو، بلند نظری اور تابناک جو ان کی شاعری کی خصوصیت ہے، یہاں بھی کارفرما ہے۔ جس طرح ان کی غزل حدیث و لہجہ سے نڈر و مدہنہ زندگی بن گئی ہے، ایسے ہی ان کے خطوں میں زندگی کا سونا پگھلا ہوا نظر آتا ہے۔

مرزا اپنا راستہ خود طے کرتے ہیں۔ ان کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ خضر کی بھی پیروی کو وہ غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ بسف وادیوں میں جہاں ان کے پاؤں چلتے چلتے جواب دے گئے ہیں، وہ سینے کے بل راستے طے کرنا چاہتے ہیں۔ وہ رسم و رواج اور تقلید کے پابند نہیں ہیں، شیخ و برہمن ان کی نظر میں ایک ہیں، ان کے یہاں اصل چیز عقیدے سے وفاداری ہے، ملتیں اہم نہیں ہیں، ان کے مٹنے سے جو ایمان بنتا ہے وہ اہم ہے۔ ان کی انسانیت کے دائرے میں دیروجرم اور زنا و زلیخ کا فرق مست جاتا ہے۔ یہی نے خطوں میں بھی ہے۔ ”یہ تو بہنی آدم کو، مسلمان یا ہندو، یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں“ ان کے دوستوں میں ہندو بھی ہیں، مسلمان بھی، سکاشانہ اول کے باو دو ہفتہ، مرزا تقیہ اور نور حسین میر مہدی اور انگریز بھی، جن میں کوئی ان کا امید کلاہ تھا، کوئی دوست، کوئی یار اور کوئی شاگرد۔

مرزا کا زندگی سے واسطہ براہ راست تھا، وہ دو برس کے تھے کہ باپ نے مرزا کا زندگی سے واسطہ براہ راست تھا۔ وہ دو برس کے تھے کہ باپ نے وفات پائی۔ پانچ سال کے ہوئے تو عجز برزگوار نے انتقال کیا۔ اس کے بعد ان کو بے شک عشرت و عیش میں مبتلا کیا لیکن اس کی ان کو قیمت بھی ادا کرنی پڑی، قرض خواہوں سے کبھی ان کو رہائی نہیں ملی، زندگی کے بہترین سال انھوں نے جاگیر کی تلگ و قذ میں گزار دیے۔ ان کے بھائی مرزا یوسف اگل ہو گئے، پچاس برس کی عمر میں خود جیل خانے گئے، ہزار امانوں کے بعد اس وقت مقرر ہوئے تو دو ہی سال میرانہ وہ قذح باقی رہا اور نہ وہ باقی، لیکن ان

حوادث کو وہ اپنے ورے بے بائی کی ایک موچ خوں بکھر کر برداشت کرنے رہے :
اس کیل کو انھوں نے باز پچھٹا اطفال بھرا اور اپنی شائستہ ظرافت اور سگفتہ متانت سے
زندگی کو سنبھالا بھی اور ستورا بھی۔

پریشانیوں اور مصیبتوں میں خود ہٹنا اور دوسرے کو ہٹانا آسان نہیں ہے : یہ
ہے نیاز مند خوش طبعی اور علی روایت خطوں میں بھی نظر آتی ہے۔ مرزا آفتہ کو لکھتے ہیں :
"مجھ کو دیکھو : آزاد ہوں نہ مقید : نہ رنجید ہوں نہ تندرست : خوش ہوں نہ ناخوش
نمرود ہوں نہ زندہ : پیچے جاتا ہوں : باتیں کیے جاتا ہوں : روٹی روز کھا آ ہوں :
شراب نگاہ گاہ پیے جاتا ہوں : جب موت آئے گی : مرد ہوں گھا : نہ شکر ہے
نہ شکایت : جو تفر رہے بر سبیل حکایت :"

مرزا حاتم علی تہ کو تعزیت کا خط لکھتے ہیں۔ کیسا نازک موقع ہے لیکن دیکھیے :
"مرزا صاحب ! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں : کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ
مرے : کیسی اشک فشان اور کہاں کی مرثیہ خوانی : آزادی کا شکوہ بجالاؤ اور غم
نہ کھاؤ۔ میں جب بہشت کا خیال کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی
اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی : آفاست جاودانی ہے اور اسی ایک نیک نخت
کے ساتھ زندگانی ہے : اس خیال سے جی گھبراتا ہے : کلیجو منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے
وہ حورا جبرن ہو جائے گی : طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی نمر دیں کلخ اور وہی طوبی
کی ایک شاخ : چشمہ درود : وہی ایک حور : بھائی ہوش میں آؤ : کہیں اور دل لگاؤ :"

مرزا آغا کلب ایک ایک جملہ خیال : انگیزے مرقع نگاری میں ان کو کمال حاصل ہے۔ یہ انداز
ظہوری و ہیدل یا مختارین اور جب علی بیگ سرحد سے مختلف ہے۔

"پانچ لشکر کا حملہ ہے : پے اس شہر پر ہوا : پہلا باغیوں کا لشکر : اس میں اہل شہر
کا اعتبار تھا : دوسرا لشکر خاکیوں کا : اس میں جان و مال و ناموس و کلان و کمین :
آسمان و زمین و آتنا و ہستی سر اسرٹ گئے :....."

مرزا آفتہ کو لکھتے ہیں :

”تم نے روپیہ بھی کھویا، اور اپنی نیکو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا، ہائے
کیا بڑی کا پی ہے اپنے اشعار کی، اور اس کا پی کی شال جب تم پر کھلتی کہ
یہاں ہوتے اور ہیگمات قطعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے، صورت ماہ دو ہفتہ
کی سی، اور کپڑے سیلے، پانچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی، یہ مبالغہ نہیں بلکہ
بے تکلف، سنبھلتاں، ایک معشوق خوب رو ہے، لیکن بد لباس،
ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

”پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم داندہ کو
شکوہ گزار پایا ہے، بس اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے تو شکایت کی
کیا گنجائش ہے، بلکہ یہ غم تو نصیب دوستان درخور انتہائش
ہے..... اور اگر خدا نہ خواستہ غم دنیا ہے تو بھائی ہمارے ہمدرد
ہو، ہم اس بوجھ کو مردانہ اٹھا رہے ہیں، تم بھی اٹھاؤ، اگر مرد ہو۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب نے اس رنج کو مردانہ وار اٹھایا، ان
کے یہاں غم شادی بھی ہے اور نوحہ غم بھی۔ ”ایک فلسفیانہ احساس ہے جس
میں رنج و راحت دونوں کی گنجائش ہے“ اور شاید دونوں کی آرزو، اُسی نے ان
کے باریات کو ہلکا کر دیا ہے اور یہی ان کا پیغام ہے، اگر غزل گو شاعر کو
کوئی پیغام ہو سکتا ہے۔

مرزا غالب کو نظم و نثر دونوں پر قدرت تھی۔ یہ سعادت، یہ بزرگی، یہ عظمت

عام نہیں ہے۔ سعدی، ظہوری اور ملتان کے علاوہ بہت کم لوگوں کو یہ مرتبہ حاصل
ہے۔ غالب کے شاعرانہ ابداعات اپنی جگہ بالکل غیر فانی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن
اگر خاتم بدین دیوان غالب نہ ہوتا اور صرف خطوط غالب ہوتے، تب بھی ان کا
مرتبہ اُدو اشعر پھر میں دہی ہوتا، جو آج ہے۔

غالب اور بے صبر

غالب کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے۔ ان کے شاگردوں نے ان کے ساتھ جس محبت اور عقیدت کا ثبوت دیا ہے، وہ اردو کے کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ خود غالب کی شخصیت میں دل نوازی اور محبوبی کی بہت سی خوبیاں موجود تھیں۔

ان کے شاگردوں میں منشی مال کنڈ بے صبر سکندر آباد ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ سوانح عمری بے صبر میں لکھا ہے کہ وہ مرزا گروپال تفتہ کے بھانجے تھے اور ۱۸۱۰ء میں بہ مقام سکندر آباد پیدا ہوئے تھے۔ مالک رام صاحب نے ان کی ولادت کی تاریخ نہیں لکھی۔ البتہ وفات کی تاریخ بغیر حوالے کے ۱۸۹۰ء اور عیسوی سن ۱۹۷۳ء میں جو صیح نہیں ہے۔ مضمون سوانح عمری بے صبر چونکہ بے صبر کے چھوٹے بیٹے سری برہما روپ نے اور بے صبر کے انتقال کے فوراً بعد لکھا ہے اس لیے

۱۔ سوانح عمری بے صبر مقالہ پسر خود بے صبر بحوالہ اردو ادب، ج ۱، ص ۲۳، ص ۹۳۔

۲۔ تلامذہ غالب، ص ۵۵

۳۔ ایضاً

اہم ہے۔ اس میں لکھا ہے :

" (بے صبری نے) پچھتر برس کی عمر میں ۱۳ فروری ۱۸۸۵ء (۱۳۰۳ھ)

شیدائری کو مقام میرٹھ رحلت فرمائی ۔

مالک رام صاحب کے بیان سے بے صبر کی تاریخ ولادت ۱۸۸۰ء قرار پاتی ہے

لیکن مؤخر الذکر نے اپنی تاریخ ولادت خود لکھائی ہے جو اس بیان کے خلاف ہے۔

مراسلہ ولادت ہندوئی میں جو کوئی صورت و معنی میں پائے

تو کر دے قافیہ کو دور تا ہاتھ ہزار و ہشت صد شصت و نہ پائے

(۱۸۶۹ء ہندوئی)

بے صبر کا ترجمہ منشی بی پرشاد بٹاش نے تذکرہ آئینہ الشعراء ہندوئی میں دیا ہے :

" بے صبر تخلص۔ منشی بال مکند ولد رے کانبہنگو کا یہ بھٹاگر سکندر آباد ضلع

بلند شہر۔ اب عمر قریب ستر برس کے ہے۔ پندرہ برس کے میں اب تک

شعر کہتے ہیں۔ فارسی اور اردو میں مرزا غالب کے شاگرد ہیں۔ صاحب دیوان

اور تصنیفات متعدد جن کی تفصیل تذکرہ معیار الشعراء ہندوئی میں کہ جہاں

فارسی کلام ان کا درج ہوا ہے، قلم بند ہو چکی ہے، ۱۷ برس کی عمر سے

۳۷ برس تک مناصب داروغگی و منشی گیری وغیرہ سرکار انگریزی پر

مأمور رہ کر اب پینشن دار ہیں اور لڑکے تو کر چا کر۔ سوائے علم عربی فارسی

عربی اور کچھ سنسکرت کے جملہ فن شاعری اور علم الہی و تاریخ و جغرافیہ و

نجوم و منطق و مذاہب سے خیلے واقف ہیں و مذہب خدا پرستی

موجود اند رکھتے ہیں اور ذوق، مومن، غالب، تقیہ اور شیفتہ وغیرہ

شعر نامی کے ہم عصر اور ہم مشاعرہ ہیں۔ راقم تذکرہ سے بھی

خط و کتابت ہے اور منہ راجد ذیل کلام خود ان کا اسس تذکرے

کے لیے بھیجا ہوا ہے اور حق یہ ہے کہ ہماری قوم میں غنیمت ہیں

”حضرت اساذی مولانا اسد اللہ خاں صاحب غائب“ کی مدح میں ہے مطلع ہے سہ
چشم بد دور ہے تر دیدہ گریاں میرا چادر آب کا اک پاٹ ہے داماں ٹیڑا
مدح کے اشعار ہیں :

جس کا غائب ہے تخلص اسد اللہ ہے نام یہ تو ہے کفر جو کہیے کہ ہے یزداں میرا
پر ہے ادلی مرا از جبر مرا استاد مرا قبلہ ہے کعبہ ہے دین میرا ہے ایساں میرا
نجلو گویا ہے حدیث اس کا جو اردو ہے کلام فارسی اس کا وہ دیوان ہے قرآن میرا
انور ہے وہی اور وہی مرا احسانا قافی آگرہ منہ ہے اور دلی ہے شرواں میرا
فاریاب اس کا ہے گھر کوچہ ہے اس کا سماج ہے نگہیر اپنا دہی اور دہی سلساں میرا
دیر عری و شفائی پہ جبین سانہیں میں کعبہ شیراز ہے نے قبلہ صفا ہاں میرا

نام پر کالہ آتش ہے قصیدے کا مرے
کہ وہ بے صبر ہے سوزِ دل سوزاں ٹیڑا

ایک موقع پر بڑے فخر سے کہتے ہیں سہ

شاعروں پہ کیوں نہ غائب آؤں لے بے صبر میں

حضرت غائب ہیں آخر کو مرے استاد بھی

اس کلیات کا ۲۲ واں قصیدہ بھی ”سہی“ ”دوہِ دل“ غائب کی مدح میں ہے اور
اس طرح شروع ہوتا ہے :

یکنائی جس طرح سے ہے جاناں کو جاں کے ساتھ

ہے یک دلی سخن کو ہماری زباں کے ساتھ

بھر رواں سے موج کو ہے جس طرح سے ربط

بھر سخن کو ربط ہے طبع رواں کے ساتھ

مانندِ لفظ و معنی و مانندِ جسم و حیاں

مثلِ صفات و ذات نہاں ہے عیاں کے ساتھ

جب تک پھرے گا چرخ، پھر میں گے زمیرے دن
گردش مرے نصیب کو ہے آسماں کے ساتھ

اس کے بعد لکھتے ہیں یہ
ستودا و تیر و مصطفیٰ و جرات اور درد

مجھ کو نہیں ہے کام کچھ ان رفتگاں کے ساتھ
ممنون و مومن، آتش و تاسخ، نصیر و ذوق

کچھ واسطہ نہیں ہے ان اہل زباں کے ساتھ
جو مہر سے ہے ذرے کو نسبت، وہی مجھے

نسبت ہے میرزا اسد اللہ حناں کے ساتھ
غالب ہے غالب اشعرا کا مرے لقب

رشتہ ملائذہ کا ہے اس نکتہ واں کے ساتھ
اس شاہِ ملکِ مظہر سے ہے مجھ کو مشورہ

مثل بزرگمہر ہوں نوشیرواں کے ساتھ
نام آدرسی وہ کیا ہے جو ہو مدیح شاہ سے

شہرتِ ظہیر کو تھی قزل ارسلان کے ساتھ
معنی نے اس کے شعر اڑائے جہان میں

عقابیہ وہ ہے اُرتا ہے جو آشاں کے ساتھ
دعویِٰ برابری کا ہے اس کو کمال سے

دلی کو ہم سری کا ہے سراصفہاں کے ساتھ
لطف ان کا کون اٹھا ہے بغیر از لطیف طبع

لاکھوں لطیفے اس کے ہیں لطفِ زباں کے ساتھ
باوصف کثرت اس کا سخن بھی گراں بہا

ارزاں یہ جنس بجکتی ہے نرغ گراں کے ساتھ
لے کیا ہے قہر گل و رقی ۱۰۲ ب

ہنگام ذکر خندہ دنداں مناسے دوست
 ہے گل فشانی بھی سخن در فشاں کے ساتھ
 بخت اس کا ہے جوان، و خود اس کی پیر ہے
 پیروں کے ساتھ پیرو جو اس کے ساتھ
 جام و صراحی و نئے و جنگ اس کے (پاس) میں
 مسرور ہے سدا انھیں خورد و کلاں کے ساتھ
 ایراں کو عہد غالب عالی جناب میں
 تباہ مقاومت نہیں، ہندوستان کے ساتھ
 ”دو درول“ اس قصیدہ کا بے قصبر نام ہے
 سوزہ دروں ہوں بھگو ہے نسبت و خاں کے ساتھ
 قصیدہ اعجاز سخن میں غائب کی پیروی پر فخر کیا ہے
 خوب کی پیروی حضرت غائب شاہ اش
 کہ وہ ملت میں مصدی کے لیے بچھلا مرصل (کڑا)
 نام بے قصبر قصیدے کا ہے ”اعجاز سخن“
 اس کا ہفتہ مضنون ہے بالادہ مختل
 اور بعض قصیدے غائب کی زمینوں میں لکھے ہیں۔ کلیات نظم غائب میں غائب کا
 مشہور قصیدہ ہے
 خیر تا بنگری بہ شاخ نہال طوطیان ز مردیں تمثال
 بے قصبر نے اسی زمین میں ایک قصیدہ عید کی تہنیت میں ”دل فریب“ کے
 عنوان سے لکھا ہے۔ مطلع ہے :

۱۔ کلیات بے قصبر غلی ورق ۱۴۲ ب ۲۔ ایضاً ورق ۱۴۲ ب
 ۳۔ کلیات نظم غائب، ذیل کثور ۲۱۹۲ ص ۲۶۹۔ کلیات بے قصبر مذکورہ میں غائب کا یہ شعر
 اس طرح درج ہے :

خیر تا بنگری بہ شاخ نہال طوطیان ز مردیں تمثال

نسبت ابرو سے یا رے ہے کمال عید کا چاند کیوں نہ ہو فے بلالؑ
 اسی طرح بعض غزلیں بھی غالب کی زمینوں میں کہی ہیں۔ غالب کی مشہور غزل ہے
 نمایاں مجھ سے، بیاباں مجھ سے۔ اس میں بے قصبر نے غالب کے مصرع پر گڑھ لگائی ہے :
 شب تہائی میں بے قصبر، قول غالب سایہ خورشید قیامت میں ہے یہاں مجھ سے
 غالب کی غزل ہے "دیدار ہے، سرشار ہے" اس کا ایک شعر بے قصبر نے
 اپنی غزل کے حاشیے پر لکھا ہے :

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
 ہر کوئی در ماندگی میں نالے سے ناحیا ہے
 اس زمین میں بے قصبر نے کیا اچھا شعر کہا ہے ۔

ہر طرف سے اب ترے عاشق کے اوپر وار ہے
 تیرے برے تیرے اور تلوار پر تلوار ہےؑ

کلیات بے قصبر میں کتابت کی بہت سی غلطیاں ہیں۔ اس میں غالب کا ایک
 مطلع اس طرح درج ہے ۔

گشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے تسکین کو دی نوید کہ مرنے کی آس ہے
 دیوان غالب کے نسخہ آخری میں یہ شعر یوں مندرج ہے :

گشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے تسکین کو نوید کہ مرنے کی آس ہےؑ
 اس زمین میں بے قصبر کی غزل کا مطلع ہے ۔

پاس آئے ورا نہ مقام ہر اس ہے خدمت میں آپ کی مجھے کچھ التماس ہےؑ
 بے قصبر نے "بے قراری ہے، کاری ہے" اس زمین میں بھی غالب کی
 پیروی میں غزل کہی ہے ۔

۱۔ کلیات بے قصبر قلمی ورق ۱۵۵ ب ۲۔ ایضاً ورق ۱۰۳ ا

۳۔ ایضاً ورق ۹۵ ب۔ نیز، دیوان غالب نسخہ قلمی ص ۲۱۲۔ ۴۔ کلیات بے قصبر قلمی ورق ۹۰ ب

۵۔ نسخہ آخری ص ۲۰۳ ۶۔ کلیات بے قصبر قلمی ورق ۹۰ ا

بے قراری سی بے قراری ہے کہ زمیں زلزلہ میں ساری ہے
 دجلہ آنکھوں سے میری جاری ہے کوئی طوفاں ہے یا کہ رازی ہے
 بے صبر نے غائب کی اس غزل میں بھی شعر کہے ہیں
 رفا عسر قطع رو اضطراب ہے اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے
 بے صبر کا مطلع ملاحظہ ہو
 جو تھجو بغیر، مشیت و جام شراب ہے اپنا دل پر آتش و چشم پر آب ہے
 غائب کا مطلع ہے

دل نازک پر اس کے حجم آتا ہے مجھے غائب
 نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمائے میں
 بے صبر نے اس روایت قافیہ میں بھی غزل کہی ہے۔ یہاں صرف مطلع درج
 کیا جاتا ہے

ہم ناصح ہے بند اک شور و حشت ہے زمانے میں
 نئے ہے کون طوطی کی صدا نفاذ خانے میں
 غائب کی شہرہ آفاق غزل ہے ”دنیا مرے آگے، تماشا مرے آگے“ اس
 کا ایک شعر بے صبر نے حاشیے پر اس طرح درج کیا ہے :
 گو ہاتھ میں طاقت نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
 رہنے دو ابھی سا غر و مینا مرے آگے
 مولانا عرشی نے پہلا مصرع اس طرح تحریر فرمایا ہے :
 ”گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے“
 بے صبر کا مطلع ہے

۱۔ کلیات بے صبر مذکورہ ورق ۸۹ ب

۲۔ ایضاً ورق ۸۸ ب

۳۔ ایضاً ورق ۹۰ ب

جب منہ سے نقاب اس نے اٹھایا مرے آگے
ایک نور کا عالم نظر آیا مرے آگے
بے صبر نے جرات کی تقلید میں بھی شعر کہے ہیں
کچھ بن آتی نہیں بے صبر بہ قول جرات
قید عصمت میں ہے وہ جس کے گرفتار میں ہم
جرات کی غزل پر ایک مدح کہا ہے

مدت سے شب وصل کے ہونے کی خبر تھی
ہر شام سے تا صبح نظر جانب درختی
سو آج وہ شب رشک شب قدر مگر تھی
لیکن نہیں معلوم گھڑی تھی کہ پہلے تھی
کچھ ہم تو نہ سمجھے کہ شب وصل کدھر تھی
نیک زلف سے بچ پر جو نظر کی تو محسوس تھی
بے صبر نے غائب کے انتقال کی تاریخیں بھی کہی ہیں

ہماں میرزا غائب استاد من
بجاں آفریں جاں چو آئینہ پرو
پر پریدم از دل سن رحلتش
بنالید و گفت آہ غائب بمرو

۱۲۸۵ھ

اردو کا قطوب ہے

اسد اللہ خاں وہ غائب آہ
جب سدھائے بسوے غلہ ہوئے
جس سے اہل کلام تھے مغلوب
سخن ان کے الم میں سینہ کو ب

اس پہر سخن کے اختتام کا مجھ کو سالِ غروب تھا مطلوب
کہا جیسی نے از سرِ حسرت ہوا جیت آفتابِ ہند غروب

۶۱۸۶۹

بے قہر کو یہ "دیوان" بہت عزیز تھا۔

شعر سن کر جس کو دیوان کہا کرتے تھے آپ

اب وہی بے قہر دیکھو صاحبِ دیوان ہوا

اس کی وجہ یہ تھی کہ مرزا غالب نے اس دیوان کی (جس کو کلیات کہنا

زیادہ صحیح ہے) اصلاح دی تھی۔

جب حضرت غالب نے وہی اصلاح اس دیوان کو

بے قہر کامل ہو گیا اور مستبر میرا سخن

بے قہر نے اس اصلاح کی تاریخ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۷ء) درج کی ہے۔

مخطوطہ کلیات بے قہر کا یہ تعارف ناقام رہے گا اگر اس کے پہلے قصیدے

"نوبہار" کا ذکر نہ کیا جائے جو ہندوستان کی تعریف میں ہے اور جس کو میرے

خیال میں اردو کی وطنی شاعری میں اولیت کا درجہ حاصل ہونا چاہیے۔ اس لیے

کہ اس میں وطن کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ شعرا سے ماقبل سے مختلف اور نیا

ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ "دیوان" ۱۸۵۷ء میں اصلاح پاکر مرتب ہو گیا تھا۔

ورق ۱۳۷ الف :

خاکِ روئے زمیں ہے ہندوستان

گر سوید انہیں ہے ہندوستان

یک طرف تا پچیں ہے ہندوستان

رنگِ حنلہ بریں ہے ہندوستان

مجمع العارفین ہے ہندوستان

خطِ دل نشیں ہے ہندوستان

دل نشیں کیوں سوا ہے اس کا

دو طرف بھر و یک طرف ہے سندھ

مرد و زن یہاں کے حور و غلمان ہیں

یہاں کے عارف جہاں میں ہیں معروف

..... ورق ۱۳۸ الف :

کبھی خالی نہیں ہے ہندوستان

پہلو ان و حکم و عارف سے

کہ بہت اولیں ہے ہندوستان
 دو جہاں آفریں ہے ہندوستان
 ترنگل و یاسعیں ہے ہندوستان
 گر عجب گل زمین ہے ہندوستان
 خط روے حیس ہے ہندوستان

شاہر نازیں ہے ہندوستان
 دامن و آستیں ہے ہندوستان
 کہ ازل سے گزیں ہے ہندوستان

کہ سبک آبلگیں ہے ہندوستان
 کیونکہ اس کی زمین ہے ہندوستان

ہے تواریخ ہند سے ظاہر
 یہیں برہما تھا جدِ ہر دو جہاں
 جہاں دیکھو وہاں ہے باغ و بہار
 کہتے ہیں گل زمین کے سیاح
 مروج چشمِ حسن ہیں ہندی

.... ورق ۱۳۸ ب :

تاز اس کا نہ کیوں نیاز آٹھائے
 پائے تمکیں کو دستِ بخشش کو
 حق ابد تک رکھے اسے آباد

.... ورق ۱۳۹ الف :

حق اسے سنگِ تفرقہ سے بچائے
 تو بہار اس قصیدہ کا ہے نام

غالب اور آزدہ

مفتی صدر الدین خاں آزدہ دہلوی کا پایہ علم و فضل اور شجاعت و شرافت میں بہت بلند ہے۔ وہ مولانا فضل امام خیر آبادی اور حضرت شاہ عبدالقادر کے شاگرد تھے اور دہلوی فضل حق کے ہم سبق۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے ایک فارسی خط میں جو انھوں نے لکھتے کے مولانا امین اللہ کے نام لکھا تھا، ان کا شمار دہلی کے "فضلائے نامدار" میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ فنون عقلی و نقلی اور ادب و اصول میں مہارت تام رکھتے ہیں۔

تذکرہ کریم الدین، میں لکھا ہے:

"آزدہ..... گنجینہ علم و کانِ حلم و بحرِ سخا، مخزنِ لطفت و جود عطا، لمیدہ دور اس، حسانِ ہندوستان، عالمِ کامل، فاضلِ اجل، نقیبِ بے مثل، عالمِ باعلیٰ، مدح میں ان کی جو نگھوں سو کم ہے، کیوں کہ وہ ایسا ہی عالم ہے..... ہر چند کہ مناسب نہیں کہ اس تذکرہ شعرائے آردہ میں جو کہ ان کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا ان کا نام نگھوں مگر اتنا میں جانتا ہوں کہ بدوں نامِ نامی ان کے کی یہ کتاب رونق نہ پاوے گی اور پسند احباب

نہ ہوگی کیوں کہ اس زمانہ کے شعرا اُردو گوئیوں میں مثل شاہنشاہ کے ہیں۔
مولوی بشیر الدین احمد دہلوی نے لکھا ہے :

” (اُردو) ایسے مجتمع اوصاف حمیدہ اور خصائل برگزیدہ کے تھے کہ آج
کا نام نیک اور شہرہ معدلت ضرب المثل ہے..... بے شائبہ تکلف و
بے آمیزش ایسا فاضل اور ایسا کامل سوائے سرگروہ علماء کے بساط
عالم پر جلوہ گر نہ تھا۔“

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ اُردو کے دیوان خانے میں اہل علم کا مجمع رہتا
تھا اور اس کی حیثیت ایک اکیڈمی کی سی تھی۔ ان کا مذاق سخن بہت پاک تھا۔ افسوس
ہے کہ ان کا نہ تو دیوان ملتا ہے اور نہ تذکرہ شعرائے ریختہ۔ لیکن حالی نے جو اقوال اُن سے
منسوب کیے ہیں ان سے ان کی نکتہ بینی اور سخن بھی کا پورا ثبوت ملتا ہے۔

یہ اشعار ایک اعلیٰ درجے کا شاعر ہی کہہ سکتا ہے۔
میں اور ذوقِ بادِ کوشی نے گئیں بھے یہ کم نگاریاں تری بزمِ شراب میں

کامل اس فرقہ زما میں اٹھنا نہ کوئی کچھ ہوئے تو یہی دندانِ قدح خوار ہوئے

مکھڑا وہ غضب زلفِ سیاہ نام یہ کافر کیا خاک جے کوئی، شب ایسی، سحر ایسی

اے دل تمام نفع ہے سوئے عشق میں اک جان کا زیاں ہے سوا یا زیاں نہیں
ملنا ترایہ غیب سے ہو بہرِ مصلحت ہم کو تو سادگی سے تری یہ گمان نہیں
اتھا ہوا نکل گئی آہِ حزیں کے ساتھ اک قبر تھی، بلا تھی، قیامت تھی کہاں نہیں
کشتی کسی طرح سے نہیں یہ شبِ فراق شاید کہ گردِ شس آج تجھے آسمان نہیں

۱۔ تذکرہ کویم الدین، ص ۱۰۴، ۱۰۵ کے علاوہ ملا علی محمد جو سخن شعرا (نوکلشور) از آستانہ، ص ۲۲۔

۲۔ واقعات دارالاحکومت دہلی، ج ۲، ص ۱۲۰ (شخصی مشین پریس، انگریز)۔

افسردہ دل نہ ہو در رحمت نہیں ہے بند
کس دن گھلا ہوا در پیہر مغاں نہیں
آزردہ نے پڑھی غزل اک سے کہے میں کل
وہ صاف تر کہ سینہ پیر مغاں نہیں

دامن اس کا تو بھلا دور ہے ہاں دستہ جنوں
کیوں ہے میکا گر بیاں تو مرادور نہیں

گھر سے گھر کے اٹھلے پاؤں ہر اک کھٹکے پر
کیوں کل آتے ہو دھوکے میں جو کتاب نہیں

اسی کی سی کہنے لگی اہل حشر
کہیں پریش دوا خواہاں نہیں

غائب نے اس قطعہ میں ان کی سخن در پی کا اعتراف کیا ہے۔
ہند را خوشش نفسا نہ سخن در کہ بود
بادور خلوت شاں شک شاں ازوم شاں
مومن و نیر و صہبائی و معلومی و انگاہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں
غائب نے شیفۃ کو ایک مشاعرے کی شرکت کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں
ربیع راہ کی تلافی، مخدوم معظم و صدر اعظم مولوی محمد صدر الدین خاں بہادر کے دیدار سے
ہو گئی یہ شیفۃ ہی کو ایک اور مشاعرے کا حال لکھتے ہیں کہ حضرت آزردہ اگرچہ دیر میں
آئے لیکن انھوں نے آکر دل کو صفا اور زبان کو نوا بخشی اور میں نے گریستن کی زمین
میں اپنا فارسی قصیدہ پڑھا۔ حاکمی کا بیان ہے کہ یہ قصیدہ بہت کامیاب رہا۔
شیفۃ نے گلشن بے خار کے مسودے میں آزردہ کا ترجمہ شامل نہیں کیا تھا اس
کو دیکھ کر غائب نے شیفۃ کو لکھا ہے:

”گہر نہ مفتن خامہ در رویت الف بنگاوش اشعار پر دین شعاز
حضرت آزردہ ازجہ است، ہر جہ ذکر خدام بر جیس مقام در جریہ ایں
فن نہ سرا و ابرشان فضیلت باشد، لیکن اگر یہ مقتضای سطر محبت

جراتے بکار می رفت گناہے نبود، و در تلافی آں بہ پوزش نیاز نمی افتادہ
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیفتہ نے آزدوہ کا حال بڑھا کر یہ کی پوری کر دی۔ اس
کے چند چلے ملاحظہ ہوں :

”دعویٰ اور اک عظمش از جہل خیاط ازل بایں خوبی قہائے قابلیت
بر بالائے ندوخت و روشن گرفتار بایں روشن ولی و انگاہی آئینہ ضمیر سے
نیفر وخت، بایں فضیلت شاعری از ایران سرکشیدہ و بایں غفلت ساحری
از بابل نرسیدہ، با خیال شرح کمال آتش طوطی خامہ من بایں قدرت گفتار
نغمہ سنج بے زبانی است۔“

غائب نے آزدوہ کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے جو کلیات فارسی میں موجود

ہے۔ چند اشعار یہ ہیں :

تاز نمی ترکم کہ گردد قعر و درخ حبائے من	واسے گر باشد جہیں امر و بد من فروائے من
صدر دین و دولت و صدر الصدور و درنگار	میر و محمد دم و مطاع و والی و موالے من
گویم و از نکتہ چیناں و در دلم بود ہراس	کیقباو و قیصر و کیمر و دورائے من
موکیش چوں مزج عالم ست با غیر مچ بحث	پر شے دار و اسطو مید و دہمپائے من
عاجز چوں ورنائے و دست باز حکم چہ کار	میر و از خویش تا گیر و عطا و جہائے من

خاک کویش خود پسند افتاد و جذب بحد

سجدہ از بہر حرم ننگ داشت در سبائے من

غدر کے الزام میں مولوی فضل حق انڈمان بھیجے گئے۔ شیفتہ کو سات برس کی قید
ہوئی۔ آزدوہ کو بھی قید و بند کے مصائب جھیلنا پڑے، غائب نے ۱۹۶۲ء کے ایک
خط میں لکھا ہے :

”کلیات غائب“، پنج آبگ طبع ۱۹۶۶ء خط نام شیفتہ

۵۰ ”مذکرہ نگاشتن بے خار“ (شیفتہ) نول کشور، ص ۷

۷۰ کلیات غائب ص ۲۰۰ تا ص ۲۲۲

حضرت مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا، رو بکاریاں ہوئیں، آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا، نوکری موقوف، جائداد ضبط، تاجدار خستہ و تباہ حال لاہور گئے، خفا نفل کشنر اور نفٹ گورنر نے اذراہ ترحم نصف جائداد و اگداشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں، اپنی حویلی میں رہتے ہیں، اگرچہ یہ اداوان کے گزائے کو کافی سے، اس واسطے کہ ایک کاپ اور ایک بی بی، تیس چالیس روپے بیٹے کی آمدنی، لیکن امام بخش کی اولاد ان کی عزت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں، فراغ بالی سے نہیں گزرتی، خستہ پیری نے بہت گھیر لیا ہے، عشرہ ثانیہ کے اواخر میں ہیں، خدا سلامت رکھے بہت غنیمت ہیں ۛ

بھرتی کو لکھتے ہیں :

"دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر ظہر و ہند میں اس نام کا تھا... اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں، میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین، بی ماہوں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد، تینوں مرد و مظلوم و محروم و مظلوم ۛ خطرہ غلاب، ص ۲۵۸۔

آزادہ کا انتقال ۲۴ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ بمطابق ۱۲ مئی ۱۹۳۳ء کو ہوا۔ شمس الشعرا مولوی ظہور علی نے تاریخ وفات لکھی ہے ۛ

چو مولانا صدر الدین دھرم	امام اعظم آخر زماں ہوو
نہیے صدر الصدور نیک محضر	بعدل و داد چوں نوشیرواں ہوو
بروزہ بخشیدہ کرد رحلت	کہ ایں عالم نہ چلے جاوواں ہوو
ربیع الاول و بہت وجہا دم	دواخ و دوسوے دارالبحاں ہوو

چراغ بخش بہت تاریخ ولادت

کنوں گھنٹہ چراغ و وجہاں ہوو

(۲۱)

آزادہ نے انتقال سے ایک دن پہلے نواب کلب علی خاں والی رام پور کو ایک خط لکھا ہے جو نہایت اہم اور غیر مطبوعہ ہے۔ اس لیے ہم اسے تمام و کمال نقل کرتے ہیں :

جناب مستطاب نواب صاحب معلی القاب جم المناصب کثیر المناقب
معدن تغدد نواز شہسبے پایاں ، استغفار نیاز مندوں ، ملاذ عقیدت کیشاں
وامت عزہ حکم ۔

شکر الطمان والا میری طاقت سے افزوں ہے۔ حق یہ ہے کہ آپ نے میری آخری عمر میں مجھ سے ایسا سلوک کیا کہ اس کا عرض سوائے خداوند کریم کے بشر سے ہونا محال ہے۔ اللہ کریم آپ کو اپنی بارگاہ والا جاہ سے دین اور دنیا میں مارج علیا عطا فرمائے۔ میں ایک عرصہ دراز سے مرض فالج میں مبتلا تھا۔ چنانچہ اب پر بھی تمام کیفیت روشن ہے۔ اب چند روز سے تب اس شدت سے چوٹی ہے کہ مجھ کو زندگی سے یاس ہے۔ ایک میری زوجہ ضعیفہ اور دوسرا خواہر زادہ محمد احسان الرحمن خاں نام جس کو میں نے فرزندانہ پرورش کیا ہے اور نہایت یسوق اور سعادت مند اور نیک چلن ہے، ان دونوں کو آپ کی پیروی کیے جاتا ہوں ، اگر ناگوار خاطر خاطر نہ ہو تو میرے بعد ان کی خبر گیری کسی قدر فرماتے رہیں۔ یہ ایک نوحہ کا حسن سلوک میرے بعد بھی مجھ سے ہو گا ۔

پسروم بتو مایہ خویش را

تو دانی حساب کم و بیش را

شاید یہ میرا آخری خط ہے۔ ذوالجلال والا کرام آپ کو عمر خضری اور دانش فلاطونی اور اقبال سکندری عطا فرمائے۔

لے لاؤ بیگم نام تھا۔ رام پور میں نواب صاحب کے نام لاؤ بیگم کی عرض بھی فارسی میں ہے، جس میں انھوں نے آزادہ کے کتب خانے کی فہرست بھی ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے ان کتابوں کو خود کے بعد فروغ کیا ہے۔

معروضہ پانزدہم جولائی ۱۹۶۶ء مطابق بہت دسوم ربیع الاول ۱۳۸۶ھ
 نیا زمانہ محمد صدر الدین خاں صدر الصدور سابق دہلی
 پتہ پر لکھا ہے :

بسیار ضرورت زد و تریسد
 محمد صدر الدین خاں
 طرہ لطیفہ ہے کہ خائب نے آزدہ کے انتقال کے بعد جن سے زندگی بھران کے بڑے
 اچھے مراسم رہے اور جن کو انھوں نے میر و مخدوم و مطاع اور والی و مولا سب ہی کچھ کہا تھا انواب
 کلب علی خاں کو ایک خط لکھا ہے جس میں مرحوم دوست کی بیوہ کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی
 کوشش کی ہے اور ان کی ضرورت کو غیر اہم ثابت کر کے اپنا کام نکالنا چاہا ہے۔ خائب
 کی سیرت کا یہ پہلو قابل اعتراض ہی نہیں عبرت انگیز بھی ہے اہم وہ غیر مطلوبہ خط بجنسہ
 نقل کرتے ہیں :

حضرت ولی نعمت آیہ دھمت سلامت
 بعد تسلیم معروض ہے آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت امیر المسلمین نے
 مفتی صدر الدین مرحوم کی زوجہ کو پانسو روپے مفتی جی کی تجویز و تکفین کے
 واسطے رام پور سے بھیجے ہیں۔ فقیر کو بھی توقع پڑی کہ میرا مرادہ ہے گور و کفن
 نہ رہے گا جیسا کہ میرزا جلال امیر کہتا ہے ،

جرحہ لطف تو بعد از ما بما خواہد رسید
 میں نے کل ایک خط انواب مرزا خاں کو لکھا ہے۔ خدا جانے وہ حضرت
 کی نظر سے گزرے یا نہ گزرے۔ اس خط میں میں نے زوجہ مفتی جی کا حال
 یہ لکھا ہے کہ وہ لا ولد ہے اور ساتھ روپے کرایہ کے مکان اس کے تحت
 میں ہیں۔ امین الرحمن اس کا بھانجا ہے، مفتی جی کا کوئی نہیں۔
 اب اپنی حقیقت عرض کرتا ہوں۔ آخر میں تین التماسیں ہیں (کذا)

لہ دار الانشا سکارد و تعداد رام پور، خٹل نمبر ۲۵۹، میخدا دوست آفتابان اس کے بعد دوسرے لاشدیکم
 کے مقرر کردینے گئے۔
 لکھ آزدہ نے احسان الرحمن لکھا ہے۔

آپ سے، ایک تو یہ کہ میں ہزار بارہ سو روپے کا قرض رکھتا ہوں، چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں ادا ہو جائے، دوسرا التماس یہ کہ حسین علی خاں کی شادی آپ کی بخششِ خاص سے ہو جائے اور یہ سو روپے جہینا جو مجھے ملتا ہے اس کے نام پر اس کے حسین حیات قرار پائے، یہ دو خواہشیں خواہ میری زندگی میں، خواہ میرے بعد اجرا پائیں۔

تم سلامت رہو قیامت تک دوت و عز و جہ روزانہ سب دنوں روزِ شنبہ ۵ ربیع الثانی ۱۲۷۰ جولائی سال حالِ عرضداشت دوت و عز و جہ (افغان پر ۲۷ جولائی ۱۲۷۰ء درج ہے)

یہ خط مکاتیبِ غالب میں نہیں ہے، لیکن اس تاریخ کے بعد کا پہلا خط مندرجہ ذیل ہے۔ دونوں میں تعلق ہے، اس لیے اس کے چند جملے نقل کیے جاتے ہیں :

تین التماسیں سابق (تین) پیش ہوئی تھیں، سوا ب پہلے برخوردارِ نواب مرزا خاں کی تحریر سے، اور پھر جناب مظفر حسین خاں بہادر کے خط سے ان خواہشوں کے منظور و قبول ہونے کی نوید پائی۔ انشا اللہ لکھنؤم حسب ارشاد حضور اسی برس ۶۸ میں آمد زمستان یعنی نومبر و دسمبر میں میرا قرض بھی ادا ہو جائے گا اور حسین علی خاں کی شادی بھی ہو جائے گی اور اس کے واسطے اس کی زندگی تک تنخواہ جدا گانہ مقرر ہو جائے گی۔

باکریاں کارباد شوازیست علیہ معوضہ ۱۰ مارچ ۱۲۷۰ء

غالب نے نوابانِ دام پور کو خاصے خوشامدانہ خط لکھے ہیں لیکن بندگی میں بھلا نہ ہونا عہدِ دوسمبود دونوں ہی کے لیے شرمناک ہے اس لیے غالب کا جرم بڑا ضرور ہے لیکن اتنا بڑا نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے، انھوں نے انگریز حکام کی تعریف میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ان کی خودنوشت کے یہ الفاظ ان کے نہاں خانہ دل کے بہت سے اسرار

ہمارے اوپر ظاہر کر دیتے ہیں :

”گورنمنٹ میں اس کی (غالب کی) بڑی عزت ہے۔ اشرفیوں کے عوض تصدیق
مدح نظر دیتا ہے۔ اب کی بار جو لارڈ صاحب کا دربار ہوا تو موافق کے دربارداروں کی فہرست
کے صاحب کشن بہادر حصار نے کہ دریں ولایت قائم۔ غلام صاحب کشن دہلی بھی ہیں، مثل
اور رئیسوں کے اور رئیس زادوں کے اس کو بھی خط لکھا، بے چارہ بسبب بھی دوستی اور
بے مقدمہ دہی کے لاہور نہ جاسکا۔ مجھ سے کہتا تھا کہ ستر برس کا آدمی، کانوں سے بہا ہوں
اور اکثر بیمار رہتا ہوں لیکن اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں ان عوارض کو نہانتا اور
بے شک لارڈ صاحب کے دربار میں حاضر ہوتا۔ خیر آخر عمر میں یہ ایک داغ حسرت
رہا۔ حق بات کو ظاہر نہ کرنا خدا پرستی اور حق شناسی کے خلاف ہے۔ اس شخص نے
۱۸۵۵ء کے آخر میں تصدیق مدح ملکہ مظفر ولایت کو بسبیل ٹاک لارڈ ڈالمن براگورن سابق
کی معرفت بھیجا ہے اور اوائل ۱۸۵۷ء میں زمین خط انگریزی بے واسطہ انڈیا گورنمنٹ ولایت
سے اس کو ڈاک میں آئے ہیں۔

ان امور میں زیادہ سے زیادہ اس زمانے کے مخصوص حالات اور غالب کی نجی
وقتوں کی آڑ لی جاسکتی ہے لیکن ان کا جو معاملہ بعض معاصرین اور خاص طور پر آزاد
کے ساتھ رہا ہے وہ صریحاً اتنا قابل اعتراض ہے کہ اس کے لیے کوئی دہم جواز ٹھونڈھنا
مشکل ہے۔ غالب کی غفلت صرف ان کی تخلیقات میں نظر آتی ہے جہاں وہ اپنے طبقے
اور سماج کی خرابیوں سے بلند ہو کر اپنی سحر کار آواز سے سب کو متوجہ کر لیتے ہیں۔

غالب کی شخصیت اور شاعری میں

ترکی، ایرانی عناصر

انیس سو اسی کے متعلق :

اک ہر جن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہندوستان ہی کی تاریخ میں نہیں، بلکہ نوع انسانی کی تاریخ میں۔ اس سال آدم خاکی کو وہ عروج حاصل ہوا کہ افلاک اس کی ہمت کے آگے سرنگوں ہو گئے، ستارے کانپ اٹھے، چاند سہم گیا۔ انسان کے سفر، جہانِ قمر میں پہنچ گئے اور انسان نے اس کرۂ ارض کو جس پر ہم رہتے ہیں، پہلی دفعہ زمین سے ہٹ کر بطور کائی کے دیکھا اور یہ محسوس کیا کہ ہماری فلاح اور ترقی کا راز صرف یہ ہے کہ ہم اپنے کو بڑی وحدت کا جزو سمجھیں۔ اسی کے ساتھ اس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں، نظامِ شمس کے کروڑوں چھوٹے چھوٹے سیاروں میں سے ایک ہے اور فضا نے بیسٹ میں اس کی حیثیت ایک ذرے سے زیادہ نہیں۔ یہ علم جو اس کو حاصل ہوا، وہ اس کا

عشر عشر بھی نہیں جو ابھی اس کو حاصل کرنا ہے۔ اس طرح انسان کو پہلی دفعہ اس کا یقین ہو کہ نوع انسانی کے ارتقاء میں انسانی ذہن بھی برابر کا شریک ہے۔ وہ غائب طبعی سے علیحدہ نہیں بلکہ اس کا باشعور اور غیر مغلوب حصہ ہے اور انسان اپنی بے پناہ ذہنی اخلاقی اور جہاد یاتی صلاحیتوں کو ابھار کر اور نئے معانی کی تخلیق کر کے بلند تر اور برتر سعی و عمل کی طرف توجہ ہو سکتا ہے۔

دوسرے افظوں میں یوں سمجھیے کہ انسان کی ترقی میں سب سے اہم حصہ خود اس کے ذہن اور فکر کا ہے۔ لیکن طوف قمر و بارغ جگر بھی تو ہے اور اس کا دریاں اگر ہے تو صرف دانشوروں، عارفوں، فنکاروں اور شاعروں کے پاس ہے۔ اس لیے کہ ممکنہ تو ہزار ترقی کرے، وہ اقتدار کی محرم اور زندگی کے سوز و ساز کی شریک نہیں ہو سکتی۔ وجدان اور فکر کے یہ مجنوں ہماری تہذیب کی ابدی دولت ہیں اور ان کے تسلسل ہی پر چہرہ اسی ترقی کا انحصار ہے۔ ان کی تخلیق میں دانشور کی ٹپک بیدار، شاعر کا ذہن، رسا، عارف کا وجدان صحیح اور صوفی کا قلب غماز سب ہی شامل ہیں۔ اور ان ہی کے ذریعے زندگی کا قافلہ آگے بڑھتا ہے اور ماضی، حال اور مستقبل میں نئی معنویت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کی ترقی کی بنیاد یہی تہذیب ہی تسلسل ہے جو ترکیب و امتزاج کے ذریعے اور محسوس کی تہذیب کی شکل میں ہم کو عہد بہ عہد اور نسلاً بعد نسل ملتا رہتا ہے اور جس کے ذریعے ہم ہر نئی نسل کو حسن و معنی کی ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

اس اعتبار سے میں مرزا غالب کی یاد منانے کو ہوں۔ اس لیے کہ ذہن کی تربیت تہذیبی ورثے سے ہوتی ہے اور دل و دماغ کی سیرانی میں ان ادبی کارناموں کی بڑی اہمیت ہے۔ ہندوستان تہذیبی دولت سے مالا مال ہے لیکن اس تو نگری میں غالب کی تخلیقات نے مزید اضافہ کیا ہے۔ ہندوستان کی کئی ہزار سال کی تہذیبی تاریخ، حیرت انگیز کارناموں سے مملو ہے۔ اس نے دنیا کی تہذیب کے نقش میں اپنی شوخی تحریر سے رنگ بھرا ہے اور اس کے مرتق کو پہلے سے زیادہ اپنی محراب پر سجایا ہے۔ مثال کے طور پر عہد قدیم کی مقدس کتابیں، جہاد بده کی

تعلیمات، اشوک اور اکبر کے کارنامے، کالی داس کی شکستلا، سانچی کے آثار، اجنتا کے نقوش، جنوبی ہند کی بُت تراشی، اڈیسہ کے مندر، آگرہ کا تاج محل، فتحپور سیکری کے محلات، دہلی کی مساجد اور قطب مینار، حضرت نظام الدین اویا، کبیر اور نانک کا تصوف، اردو کا آغاز و ارتقا، میراجانی کے گیت، میر کی غزلیں، مندروں کے رقص، مغلوں کے حکمت آمیز قلعے، منصور اور منوہر کی رنگ کاری، بیجو اور تان سین کی نغمہ سرائی، خسرو اور غالب کی شاعری نے فنون لطیفہ کو ان جمالیاتی بلند یوں تک پہنچا دیا ہے جس پر خود تاج کو رشک ہے۔ اس فن تعمیر، اس سنگ تراشی، اس مصوری، اس رقص، اس شیوہ بیانی کے پیچھے آخر وہ کون سی مضطرب آرزو ہے جس نے ان فنی تخلیقات کو دوام بخشا ہے، وہ کون سا رکشن ذہن کا فرما ہے جو برابر موت کی حقیقت سے انکار کرتا رہا اور یہی کہتا رہا:

مرگ، اک ماندگی کا دفعہ ہے
یعنی آگے جلیں گے دم لے کر

ہندوستان ایک عظیم الشان تہذیب کا وارث ہے اور اس باغ کی شادابی اور خوش نمائی اس میں پوشیدہ ہے کہ اس میں صرف ایک رنگ یا ایک قسم کے پھول نہیں ہیں بلکہ بہت سے رنگوں کے اور بہت سی قسموں کے پھول ہیں، اور ان سب کی شادابی پر ہمارے باغ کی شادابی اور خوش نمائی کا انحصار ہے۔ تہذیب کا وہ سرچشمہ جو مومبھارو سے بھی پہلے پھوٹا تھا، عہد قدیم عہد وسطیٰ اور عہد جدید کے میدانوں سے گزرتا ہوا ہم تک پہنچا ہے اور ان مختلف تہذیبی نیروں نے ہمارے باغ کو اتنی سرسبز و شاداب بنا دیا ہے کہ باوجود ہزاروں ماہ و سال گزرنے کے اس پر کسی قسم کی گلا جٹ کا اثر نہیں۔ یہاں مختلف قومیں اور تہذیبیں آئیں۔ ان میں آویرش بھی ہوئی اور آمیزش بھی۔ لیکن ان موجوں نے اس تہذیب کی مٹی کو پہلے سے زیادہ نازخیز بنا دیا اور اس قدم میں وہ رنگا رنگی، وہ خوب صورتی، وہ گہرائی، وہ گیرائی پیدا کر دی جو ہمارا ہی نہیں، نوب انسانی کا بیش قیمت ورثہ ہے۔

ہندوستانی تہذیب میں جو بنیادی عنصر کارفرما ہے، وہ کثرت میں وحدت اور مظاہر کی رنگارنگی میں، اصل حقیقت اور ماہیت کی جستجو ہے۔ اکبر کہا کرتا تھا کہ نقاشی کے ذریعے مجھے عرفان الہی کی ایک مخصوص انداز میں آگہی حاصل ہوتی ہے۔ غالب نے پتھروں میں قصے بتانے کی آرزوی کا نظارہ کیا ہے۔

غالب کی شاعری میں بھی انہی بنیادی تصورات اور اسی جمالیاتی شعور کی کارفرمائی ہے۔ غالب کی شخصیت کا تار و پود ترکی، ایرانی اور ہندی عناصر سے مل کر بنا ہے اور ان کے ذہن کے تمام نقش و نگار ان کی طبیعت اور مزاج کے علاوہ ان کی طبیعت اور معاشی ماحول اور تمدنی اور تہذیبی ورثے سے مل کر ترتیب دیے ہیں۔ یہی وہ تشکیلی اثرات ہیں جنہوں نے ان کی جمالیاتی اقدار کی صورت گری کی ہے اور جو میرے اس کچھ کا موضوع ہیں۔ اس لیے کہ اگر ہم غالب کے افکار کی نفسیات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان تہذیبی عوامل کی نشاندہی کرنا ہوگی جو صدیوں اور نسلوں سے گزر کر اور چین کر ان کی شخصیت اور شاعری میں نشین ہو گئے تھے جنہوں نے ان کو قدروں اور معیاروں کا ایک ہم آہنگ تصور بخشا اور جن کی بدولت ان کی شخصیت میں دلکشی اور شاعری میں توانائی اور تازگی پیدا ہو گئی۔

ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ انسان، فطرت سے ہم آہنگ یا شکست کے ذریعے جو تجربات حاصل کرتا ہے، تہذیب اسی کی مرتب شکل ہے۔ راز فطرت کی تلاش و جستجو اور فطرت کے خلاف جدوجہد تہذیب کے سفر کا زادہ ہیں۔ کسی خاص تہذیب کے انداز کا انحصار انسان کی طبیعت اور مزاج کے علاوہ اس کے ماحول کی نوعیت اور ان کے باہمی عمل اور تعامل پر بھی ہوتا ہے۔ اس طرح سوچے تو معلوم ہو گا کہ غالب کی شخصیت اور شاعری کو ہند، ایرانی، ترکی تاریخ کے پس منظر ہی میں سمجھا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے اجتماعی ورثے، ان کے ملکی ماحول اور ان کی شخصیت اور مزاج نے باہم مل کر یہی ان کے ذہن کے نقش و نگار ترتیب دیے ہیں۔

غالب کے اجداد وسط ایشیا کے رہنے والے تھے اور یہ وہ علاقہ ہے جہاں آریائی تہذیب کی پہلی کرن چھوٹی۔ اس جغرافیائی علاقے کی حد ہندی قدرت نے کچھ اس طرح کی

ہے کہ ایک طرف کوستان الطائی ہے، دوسری طرف بحر کمپین۔ نیچے پامیر اور قراقرم کے پہاڑ، مشرق میں گوبی کا ریگستان اور مغرب میں آمور، سرود یا اور زرافشاں کے چھوٹے چھوٹے نخلستان یہی وہ خطہ ہے جو تہذیب کا گہوارہ کہلاتا ہے۔ ماہرین ارضیات کا خیال ہے کہ یہ علاقہ ایک زمانے میں جھیلوں اور آبشاروں سے بھرا ہوا تھا لیکن آب و ہوا کی تبدیلی سے خشک ہونا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ سیکڑوں بستیاں ریت میں دھنس گئیں۔ بادشس کی قلت اور فقدان راحت سے مجبور ہو کر ترکستان کے رہنے والے ہجرت پر مجبور ہوئے اور یہ سلسلہ غالب کے انتقال سے ایک سال پہلے تک اسی شدت سے جاری رہا۔ کہا جاتا ہے کہ ۶۱۸۶۸ میں ۸۰۰۰۰ ترک، غالب کی زبان میں عالم ارواح کے گنہگار اپنی بے آب و گیاہ زمین چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور ان کو شاہ اب علاقوں میں آکر پناہ لینا پڑی۔ اسی طرح بالکل دوسرے اسباب کی بنا پر ۱۶۵۰ء میں دوسرا ترک، لداخ کے راستے سے سری نگر میں آکر پناہ گزین ہوئے اور آج بھی ان کے قبائل صفا کہل میں مقیم ہیں۔ ترک یاؤں کو ترک نہیں بیٹھتے۔ غالب بھی کبھی مانع دشت نور دی نہیں رہے اور ان کی آوازیں سے آشنائی اور عافیت سے دشمنی، قدیم اور اذلی ہے۔ کھٹکے کا سفر بھی قطعاً سلسلہ شوق نہیں تھا، فرماتے ہیں :

اگر بہ دل نہ خسلہ ہر چہ از نظر گذرد

ز بے روانی عمرے کہ در سمنہ گذرد

مرزا غالب کے اصل و گویہ کا حال جیسا کہ انھوں نے مہر پور کے دیباچے میں لکھا ہے، یہ ہے کہ ان کے بزرگ سمرقند میں آکر بس گئے تھے اور وہاں سے جس طرح سیلاب بلندی سے پستی کی طرف آتا ہے، ہندوستان کی طرف منتقل ہوئے :

”از واپسیان این قافلہ نیامے من کہ در قلو و ماوراء النہر سمرقند شہر سقط الراس

دے بود چوں سیل کہ از بالا بہ پستی آید۔ از سمرقند بہ ہند آمد۔“

اس علاقے کو بہت سے مورخین نے ایک بڑے حوض سے تشبیہ دی ہے جب اس میں پانی بھر جاتا ہے تو وہ ہندوستان کی طرف بہہ نکلتا ہے۔ غالب نے اس واقعے کو

اس طرح بیان کیا ہے : چوں سِل کہ از بالا بہ پستی آید از سمرقند بہ ہند آمد۔ درفش کاویانی
میں زیادہ وضاحت سے لکھا ہے :

" بالجلد سلجوقیان بعد زوال و برہم خوردن جنگکارہ سلطنت وراقلمہ وسیع الفضاء
ماورا، النہر یدرگند و شدند اذان جلد سلطان زاوہ ترسم خان کہ ما از تخیم اویم
سمرقند را بہر اقامت گزید۔ تا دہ عہد سلطنت شاہ عالم نیامے من از سمرقند
بہ ہند وستان آمد "

غالب نے اپنے فارسی اشعار میں بھی اس علوے خاندان پر فخر کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

غالب از خاک پاک تو را نیم لاجرم در نسب فرہ مندیم
ایکیم از جماعت اتراک در تمامی زمانہ وہ چہ مندیم
فن آباے ما کشاورزی ست مرزباں زاوہ سمرقندیم

یہ سمرقند کا علاقہ تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے لیکن اس نے چین قب اور
طرف کلاہ کے بھی بہت سے مناظر دیکھے ہیں۔ سکندر اعظم ایک ہاتھ میں تلوار اور
دوسرے میں ہومر کی ایڈ (ILIAD) لیے ہوئے آیا اور اس نے اس سائے
علاقے کو زیر و زبر کر دیا۔ فلسفیوں نے انسانی جڑیوں کا سفوف ہاتھ میں لے لے کر
بہت پوچھا کہ اس میں بادشاہ اور غلام کی تفریق کس طرح کی جائے لیکن سکندر
نے انتقام کے جوش میں لاشوں کے پل بنا دیئے اور ایرانی تہذیب کے نادر و روزگار
ایوانوں میں آگ لگا دی۔ اسی طرح تانہاریوں کا سیلاب اٹھا جس نے اپنی ہلاکت آفریں
گرفت میں روس اور ہنگری تک سب کو لے لیا۔ اور ایس وسیع و عریض حکومت
قائم کی جو چین کے ساحل سے لے کر ڈینیوب (DANUBE) اور نیچے پنجاب تک
پھیلی ہوئی تھی۔ اس سمرقند نے تیمور کی جہاں کشانی اور جہاں بانی کے غوناگوں
مناظر دیکھے جس میں سفاکی بھی شامل تھی، ادب نوازی بھی، معارف پروری بھی۔
چنگیز خاں کے پورے سو سال کے بعد سمرقند جاگا تھا اور اس طرح کہ وہ سانس
ادب، فن تعمیر اور مصوری کا عالمی مرکز بن گیا تھا لیکن اب وسط ایشیا میں ایرانی

تہذیب کے ناخاند سے عجم زدہ عرب نہیں تھے بلکہ ترک تھے اور ترکوں سے مسیری مراد تورانی نسل کے وہ تمام لوگ ہیں جو وسط ایشیا اور چینی ترکستان میں بس گئے تھے اور ایران کو اپنا تہذیبی سرچشمہ سمجھتے تھے۔

وسط ایشیا سے بہت سی قومیں موج در موج ہندوستان میں داخل ہوئیں۔ اسی طرح مسلمان ترک ہندوستان میں آئے لیکن وہ حجاز کے عربوں اور اصفہان و شیراز کے ایرانیوں سے یکسر مختلف تھے۔ خلافتِ مکہ دور اور بے دست و پا ہو گئی تھی اور اس کے ویرانہ پر خود مختار ترکی ایرانی (TURKO-PERSIAN) حکومتوں کے محلِ تعمیر ہو گئے تھے مسلسل فتویا یوں نے مذہبی جذبے کو سرد کر دیا تھا اور اب یہ ترک ہر عام کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ یہ بات شرع کے مطابق ہے یا نہیں۔ جو بات حکومت کے لیے مفید ہے ہم اس کا حکم صادر کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے۔ ان کے علاوہ تمام صوفیہ، اہلِ تعلید، اہلِ ظاہر اور اہلِ اختیار سے نبرد آزما تھے۔ ان کے نزدیک اقدار میں سب سے اہم قدر محبت تھی جس سے دل کی دستوں میں اضافہ ہوتا ہے جذبات کی تہذیب ہوتی ہے، فرد کی اہمیت بڑھتی ہے، رواداری اور مساوات اور جمہوریت کی جڑیں سیراب ہوتی ہیں۔ دارا شکوہ کی جمیع البحر میں، شاہ غلجین کے خطوط، غالب کے اشعار اور شفقِ فیض کے مطالب سب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس وقت ویدانت اور اسلامی تصوف ہم آغوش ہو گئے تھے۔ ملتیں اہم نہیں رہی تھیں بلکہ ان کے منہ سے جو ایمان بنتا ہے وہ اہم تھا۔

ہندوستان میں ۱۲۰۶ء میں جو حکومت قائم ہوئی وہ مزاج اور کیفیت کے اعتبار سے ترکی ایرانی تھی یعنی اس کے آمیزہ میں ایران کا احساسِ جمال اور حسنِ تناسب اور ترکستان کی وسیع الشرفی اور سخت کوشی دونوں شامل تھیں جو ہندوستان کی آریائی فضا میں اُن مل بے جوڑ نہیں تھی بلکہ اُس نے اس کے حسن کو نکھار دیا اور خود ایرانی تہذیب کے جسمِ مردہ میں نیا خونِ زندگی دوڑا دیا۔ لیکن ترکی ایرانی تہذیب کا احیاء دراصل مغلوں کے ذریعے ہوا جب بابر نے اپنے

وطن فرغانہ کو چھوڑ کر سنہ ۱۷۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد ہندوستان میں قائم کی۔

غالب کا تعلق مغلوں سے براہ راست تھا وہ نسباً اور اصلاً اس قوم کے فرد تھے جس کا ایک قبیلہ دہلی کے تخت پر حکمران تھا۔ ترکوں میں قدیم سے یہ قاعدہ ہے کہ باپ کے متروکے میں سے بیٹے کو تلوار کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ غالب کو درختے میں یہ ترک ایرانی ذہن تو ملا لیکن اپنے آباء کی تلوار نہ مل سکی۔ البتہ بزرگوں کو یہ تیر ٹوٹ کر ان کا قلم بن گیا۔ شدتیر شکستہ، نیا گھاں قلم، شاعری کے میدان میں البتہ اس کی حیثیت تیر پنکش کی ہو گئی ہے۔

یہ قبیلے جب ہندوستان آئے تو ان کی پشت پر صدیوں کی وراثت تھی۔ ان کے ساتھ ایک اجتماعی ذہن تھا جس کے سارے نقش و نگار اسی ترک ایرانی ماحول میں صورت پذیر ہوئے تھے۔ وہی علوے نسب کا احساس، وہی اسلاف کے کارناموں پر فخر۔ غالب ایک قطعہ میں لکھتے ہیں :

ساقی جو من پشنگی و افراسیابم
دانی کہ اصل گوہرم از دورہ جمست
میراثِ جم کہ سے بود اکنون بمن سپار
ز بس پس رسد بہشت کہ میراثِ آدمست

غالب کے یہاں جو جیند و سر بیج و مالائے مردوارید یا در بار و لبر پر اتنا اصرار ہے، اس کا سرچشمہ بھی یہی ہے۔ ان قبیلوں میں عصبيت بھی بلا کی تھی۔ غالب کا تعلق ایک ترکوں میں قبیلہ برلاس سے تھا اور مجھے تا شغف اور سمرقند کے قیام میں معلوم ہوا کہ اس قبیلہ میں یہ عصبيت کوٹ کوٹ کے بھری تھی۔ لڑائی ہے تو سالہا سال اور نسلاً بعد نسل جاری رہے گی۔ دوستی ہے تو اپنی کھال کی جوتیاں بنا دیں گے۔ خود خاقد کرلیں گے لیکن مہمان کے سامنے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیں گے۔ اسی طرح غالب اپنی پیش کش کا مقدمہ ایک دو برس نہیں مسلسل ۴۳ برس تک لڑتے رہے۔ انھوں نے اس زمانے کی صریح بے انصافیوں کے خلاف جس کی شکایت بعض ایماندار انگریزوں

کو بھی تھی اور خود مقامی حکام کے خلاف گورنر جنرل سے اپیل کی۔ جب وہاں بھی دادی نہ ہوئی تو کمپنی کے ڈاکٹروں اور آخر میں ملکہ وکٹوریہ سے اپیل کی۔ ان کی دستخطی ایک معنی میں اسی سلسلے کی ہوش مندانہ کوشش ہے۔ جب عامیان قنیل سے معر کے اور مجا ولے ہوئے تو غالب اس طرح لڑے جیسے ترک اور تورانی لڑتے ہیں۔ ان ترک قبیلوں کو اپنی عزت اور آبرو جان سے زیادہ عزیز تھی۔ غالب پر فائے گذر ہے تھے لیکن وہی کالج کی ملازمت کے معاملے میں انھوں نے صحیح یا غلط، عزت کا سودا نہیں کیا۔ جوئے کے الزام میں قید ہوئے تو جسیہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مجرم کی نہیں بلکہ بادشاہ کی سواری اس زنداں خانہ میں داخل ہو رہی ہے۔ اسی طرح جرم زخموں کی کثرت سے سرد چراغاں بن گیا ہے اور موت ہے کہ روز دروازے پر دستک دیتی ہے لیکن جب توہین کا سوال پیدا ہوتا ہے یا ان کی حیثیت عرفی پر ضرب لگتی ہے تو وہ مولوی امین الدین بٹالوی کے خلاف مرنے سے دو برس پہلے انگریزی عدالت میں ازالہ حیثیت کی نائنش کرتے ہیں۔ اثنائے تحقیقات میں وہی کے بعض اہل قلم عدالت میں بلائے گئے کہ جو فقرے مدعی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے ہیں ان سے دشنام و فحش مفہوم ہوتا ہے یا نہیں۔ ان حضرات نے ملزم کو سزا سے بچانے کے لیے ان جملوں کے ایسے معافی بیان کیے جن سے ملزم کی بھت ہو جائے۔ کسی نے پوچھا حضرت یہ تو آپ کے شناسا ہیں، انھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی۔ فرمایا: میری بیکیسی کی وجہ، شرافتِ نسبی ہے کیونکہ ہر شخص اپنی جنس کی طرف مائل ہوتا ہے اور چونکہ شرافتِ نسبی میں کوئی سبب ہم جنس نہیں ہے، اس لیے میرا کوئی ساتھ نہیں دیتا۔

بہرچہ درنگری مجز بہ جنس مائل نیست

عیارِ بیکیسی من شرافتِ نسبی ست

قدیم ترکوں میں ایک قسم کی دنیا داری، عقلِ معاش، عیش پسندی اور پرکاری بھی ملتی ہے جو مختلف گروہوں سے مقابلے کی شدت سے آئی ہے اپنے مقاصد کو

حاصل کرنے کے لیے وہ کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ غالب کا جو یہ نواب شمس الدین خاں یا خود اپنے بھائی مرزا یوسف یا اپنے عزیز دوست مفتی صدر الدین آزاد کی بیوہ کے ساتھ تھا وہ ہمیں بڑا عجیب اور قابلِ اعتراض معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں ان کے طبقے کی مجبوریوں کو بھی دخل ہے اور اس قسم کی متوازی مثالیں ہمیں آخر دورِ مغلیہ میں بھی مل جاتی ہیں، جہاں مقصد زیادہ اہم ہے اور طریقہ کار ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

ترکوں میں اصابتِ راس کے ساتھ تنقید کی شدت اور عدم برداشت پائی جاتی ہے۔ باوجود ہزار محبت اور عقیدت کے وہ اداروں اور شخصیتوں کی نکتہ چینی میں پس و پیش نہیں کرتے۔ جہانگیر کے دربار میں حضرت شیخ سلیم چشتی کے فیوضِ روحانی کا ذکر تھا۔ قاضی نور اللہ شونسری کو حضرت علی کرم اللہ وجہ کے ساتھ یہ ذکر اچھا معلوم ہوا، فرمایا: آنچہ مردک بود۔ جہانگیر حضرت شیخ سلیم چشتی کا بڑا معتقد تھا۔ ان ہی کی دعا سے پیدا ہوا تھا حکم دیا کہ مولانا کا سر قلم کر دیا جائے۔ نور جہاں نے رحم کی درخواست کی اس نے کہا: جاناں دل داوہ ام نہ ایمان۔ اور رنگِ زیب نے اپنے استاد پر سخت نکتہ چینی کی تھی کہ تم نے مجھے یورپ کی تاریخ نہ پڑھائی اور ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ دنیا میں بس مغل ہی مغل ہیں۔ اسی طرح غالب نے باوجود مغل ہونے اور مغلیہ تہذیب سے محبت رکھنے کے آئینِ اکبری پر اعتراض کیا ہے اور اس پر آئینِ فرنگ اور منہاجی داود دانش کو ترجیح دی ہے۔ یہی معاملہ غالب کا شاعری کے میدان میں ہے۔ ایک خط میں حزیں کے ایک مطلع پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہ نظم ہے یہ عجب ہے حزیں تو آدمی تھا یہ مطلع جبریل کا بھی ہو تو سند نہ جاناؤ"

غالب مغل تھے، ہاڑ چکلا، قد کشیدہ، رنگت خوب کھلتی ہوئی۔ ان کی رگوں میں وہی خونِ موجِ زن تھا جو مغل بادشاہوں کی رگوں میں تھا۔ ان ہی لوگوں کی طرح ان کو زندگی کی اچھی چیزوں سے محبت تھی۔ اچھا کھانا اچھا پینا اچھا رہن سہن۔ بابر کی مادری زبان ترکی تھی اور غالب کے دادا کی زبان بھی ترکی تھی لیکن مغل ایرانی تمدن میں اس قدر رشار تھے کہ انہوں نے اپنے کمالات کے جوہر فارسی میں دکھلائے اور اس کو

اپنی تہذیبی اور سرکاری زبان قرار دیا۔ پروفیسر آرہمی نے لکھا ہے کہ عربوں کے اثر سے فارسی زبان بھی صحرازدہ جوگئی تھی اور ہندوستان کے طبعی ماحول نے تو اس کے رنگ و آہنگ کو ایران کے طرز و روش سے اس قدر مختلف کر دیا تھا کہ ہندوستان کے اسلوب کو سبک ہندی قرار دیا گیا۔ اس طرز کی بہت عیب جوئی کی گئی ہے جس پر چنداں حیرت نہیں لیکن افسوس اس کی بنیاد مٹی پر ہے۔ متاخرین شعرا کی بدولت اس میں جو حسن کاری کا عنصر پیدا ہوا۔ اس کا عدم اعتراف بدترین قسم کی ناخوشگواری ہے۔ اس قسم کا تخیل کہ غزلے یا مہراے جان می گذشت یا ہمہ آہوان صحر اسر خود نہادہ برنگ ، یا آرد ویں ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام یا آہو آجائیں گلے خود شوق سے گردن ڈالے ، ہندوستان بھی کے طبعی ماحول میں ممکن ہے ، تبریز و طوس میں ممکن نہیں۔

غالب کے اجداد کو ہندوستان میں آکر جس ماحول اور مزاج سے سابقہ بڑا ، وہ وسط ایشیا سے مختلف تھا۔ یہ لوگ جہاں آکر رہے وہ بالعموم سطح اور کسی قدر مرتفع میدانوں پر مشتمل تھا جنہیں بڑے بڑے دریا سیراب کرتے ہیں۔ یہاں گھنے جنگل تھے یا وسیع و عریض میدان۔ یہاں کے موسم مقرر تھے اور ان میں زیادہ افراط و تفریط نہیں ہوتی تھی۔ یہاں حقیقت ایسے زمان میں کام کرتی ہے جو سمورو مسلسل ہے اور بے اعتبار پیمائش و ایری ہے۔ یہاں کائنات ناقابل اختلاف صورت میں ہے تماشا پھیلی ہوئی تھی اور شدت حیات کے ساتھ دھڑک رہی ہے۔ بظاہر ان مختلف مناظر میں بہت فرق ہے لیکن غور کیجیے تو ساری موجودات اپنی کثرت اور بونگھونی کے باوجود ایک حقیقت نظر آتی ہے۔ موضوع کی وحدت معروض کو اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے یا تصوف کی اصطلاح میں بندہ و بندہ نواز ، عاشق و معشوق کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ یہی خصوصیت ہندوستانی ذہن کی ہے وہ کائنات کی تعمیر میں اور نظام فکر کی تعمیر میں ، متعدد اور مختلف مظاہر کو ایک کپلے کے تحت لا کر ہمیشہ ان میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی عمل اس تہذیبی ورثے کے ساتھ ہوا جو

غالب کے اجداد اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس کو ہندوستانی ذہن نے ترکیب و استخراج کے ذریعے اپنے رنگ میں رنگ لیا چنانچہ جن تصویری عناصر نے ہندوستان کے اجتماعی ذہن پر اثر ڈالا، وہ سب کے سب ہندوستان کی سرزمین میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ ان میں بہت سے باہر سے آئے تھے۔ ہندوستانی تہذیب میں دماوڑی، آریائی، ایرانی اور ترکمانی عناصر کی بڑی آمیزش ہے۔ البتہ وہی عناصر ہندوستانی تہذیب کا جزو بن سکے جو عام ملکی روح سے ہم آہنگ تھے۔ مغلوں کے زمانے میں جو نخل بندی اور چوند کاری کے تجربات سے گزر چکے تھے، یہ تہذیبی نقش اور زیادہ حسین ہو گیا۔ انھوں نے ترکوں کی سخت کوشی، فراخ دلی اور خود داری میں ایرانیوں کی لطافت اور شائستگی اور مسادات اور اخلاقی ضبط کی قلم لگا کر ہندوستانی تہذیب کی اس طرح آبیاری کی کہ وہ ایک تناور درخت بن گئی اور اس کی جڑیں، جمالیاتی شعور اور تصوف کی انسان دوستی تک پہنچ گئیں۔ اس زمانے کی عمارتیں، تصویریں، تصوف کی تحریکیں اور شعرو موسیقی کے کارنامے سب اس استخراج اور اتحاد پسندی کے آئینہ دار ہیں۔ مثال کے طور پر معرفت یا تصوف کے اس نئے راگ پر غور فرمائیے جو ہندوستان کے طبعی ماحول میں اسلامی اثر سے پیدا ہوا۔ اس میں عاشقانہ ذوق و شوق، سوز و ساز، تسلیم و رضا کے ساتھ مصلحانہ بلکہ مجاہدانہ جوش و خروش بھی ہے۔ ایک طرف نعمۂ عشق ہے، ذات الہی کی محبت اور رشد کی عقیدت سے معمور۔ اور دوسری طرف ترکوں کا نفوذ جنگ ہے، ظاہری رسوم و روایات، عقائد و عبادات کے خلاف، یہاں محبوب حقیقی کا تصور خالص باطنی تصور ہے جو بظاہر متضاد صفات کا جامع ہے۔ یہی صورت معشوق حقیقی کی ہے اور یہی کیفیت معشوق مجازی کی۔ پھر بھی ایک عادت کی نظر، اس کثرت میں وحدت کو ڈھونڈ لیتی ہے۔ خدا ازان و مکان سے باہر بھی ہے، تصویر سے ماوراء بھی، صفات و کمالات سے بری، دارا شکوہ، طالب حسین شاہ حسن، میرزا مظہر، میرزا جید، غلجین اور غالب کے صوفیانہ خیالات کو سامنے رکھیے، سب میں یہی بھی بندی نے کار فرما ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندو باطنیت اور اسلامی تصوف باہم مل گئے ہیں۔ اسی طرح چچوہر سیکری،

احمد آباد اور سری نگر کی عمارتوں میں، خیال اور دُسرے میں، منوہر اور عبدالصمد کی تصویروں میں امیر خسرو، رحیم، فیض اور غالب کی شاعری میں یہ امتزاجی لہر صاف نظر آتی ہے۔ یہاں امتیازات مٹ گئے ہیں اور فنون لطیفہ نے اپنے حدود کے اندر ہندوستانی طبع کو پالیا ہے۔

ترکی ایرانی شاعری میں غزل کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ یہ شاعر ایک حشرِ ایک حیات ایک مہمات اور ایک حشر و نشر کے قائل تھے اور ادب میں غزل ایک ہی موضوع پر اپنی لامتناہی دلچسپی اور موزوں الفاظ اور مناسب قافیے کے انتخاب کے ساتھ ایک خاصے کی چیز تھی۔ مضمون کے لحاظ سے اس کا خود کفالتی انداز یا اقلیدسی نقش و نگار کی طرح ایک شعر کا دوسرے شعر سے صرف باہمی صحت، عمیق تعلق اسی شعور کا شاعرانہ اظہار ہے۔ یہ ذہن پر شور دیکھتا توں اور فلک نیلگوں کی پہنائیوں میں پلا اور بڑھتا تھا چنانچہ تنیب کی شکل میں غزل کی ابتدا عربستان میں ہوئی ترقی ایران میں۔ لیکن وہ اپنے نقطہ کمال کو ہندوستان میں پہنچی۔ جہاں کی ریزہ کار فضا، کثرت میں وحدت کو دیکھ سکتی تھی اس قسم کی صفت اس کے مزاج اور طبیعت کے عین مطابق تھی۔ اس لیے غزل نے تمام ہندوستانی ادبیات پر اثر ڈالا اور خسرو، فیض، عرفی و نظیری، طالب و کلیم، ظہوری و بیدل، میر و درد، مومن و غالب کے جوہر اسی نثرین پر نمایاں ہوئے جن کی بدولت غزل اپنے منتہی کمال پر پہنچ گئی اور یہ بات بھی نظر انداز کرنے کی نہیں ہے کہ غالب کے اختراعی کمالات کا اصلی میدان غزل ہی ہے۔ قصیدہ ہے دشمنوی، نہ مرثیہ نہ رباعی۔ قصیدے میں انھوں نے کہیں خاقانی کا متیج کیا ہے، کہیں سلمان و ظہیر کا، کہیں عرفی و نظیری کا۔ اور زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر ایک منزل کا میابی سے طے کی ہے لیکن وہ قصیدے کو عریض نویسی کا ایک رسمی ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے ایک قصیدے کو معمولی قصرت کے ساتھ دو دو صدوحین کے سامنے پیش کیا اور اس کو صرف وسیلہ روزگار سمجھا ہے۔ ان کی کوئی دشمنوی فردوسی، رومی، نظامی یا جامی کے مقابلے پر پیش نہیں کی جاسکتی البتہ بعض بعض ٹکڑے بے مثل ہیں اور ہندی فارسی ادب کی آبرو۔

یہی صورت رباعی کی ہے کہ اس سرسایے کو فارسی کے رباعی گوئیوں سے کوئی بڑی نسبت نہیں۔ مولانا حالی نے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے کہ "مرزا کے کلام میں غزل کے سوا کوئی صنف شمار کے قابل نہیں ہے۔ مرزا کی موجودہ غزلیات گو بمقابلہ بعض شعرا کے تعداد میں کسی ہی قلیل ہوں لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں۔"

یہی وجہ ہے کہ غالب کو جو خیالات اور احساسات اپنے ورثے اپنے ماحول اور اپنی مخصوص اقدار و طبع کی بدولت ملے تھے ان کا جتنا خوب صورت اظہار غزل میں ہوا ہے وہ اور کسی صنف میں نہیں ہوا۔ ان کی تشبیہات استعارات و ترکیبات اپنے اندر جہانِ غنی چھپائے ہوئے ہیں۔ ان کے ذریعے غزل کا آرٹ نکھر گیا ہے اور زبان و بیان اپنی نئی بلندیوں تک پہنچ گئے ہیں۔ ان دیبچوں سے ہم غالب کی اس حسین معنویت، امتزاجی بصیرت اور شوخ ذہانت کا نظارہ کر سکتے ہیں جو ایرانی ترکیبندی خصوصیات کی نفل بندی کا نتیجہ ہے اور جو اردو کی سب سے بڑی دولت ہے۔ غالب نے غزل کے ذریعے صدیوں کی بھولی بھری یادوں اور خون گشتہ تمنائوں کو آب و رنگ شاعری میں سمو کر پیش کیا ہے۔ نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی متناکی ہے یا نشاء کا رکو خست قلیل پر مضمحل کیا ہے یا رخنہ عمر اور سواد کی بے اختیاری کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔ یا وجود و بھر کو نمود و صورت پر مشتمل سمجھا ہے یا اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے یوں دہائی دی ہے کہ کوچ جہاں پر حریف مکر نہیں ہوں میں۔ یا تسلیم کی خوبیدہ کرنے کی کوشش کی ہے یا اپنے مذہب کو یوں ظاہر کیا ہے کہ جب تئیں مٹ گئیں تو اجزلے ایمان ہو گئیں یا دوست کے سر انگشتِ خانی کے تصور کو غنیمت سمجھا ہے یا بہار کا اثبات اس طرح بھی کیا ہے کہ ہوئے مہر و تماشاں یا چشم تنگ کو کثرتِ نظارہ سے ڈاکو کی صلاح دی ہے یا دنیا کو باز بچہ اطفال سمجھا ہے یا یہ حسرت ظاہر کی ہے کہ بہت بچلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم بچلے۔ یا کوہِ طور کی سیر کا نیا دلولہ پیدا کیا ہے یا گرمِ فاری

کا یہ عالم دکھایا ہے کہ راستے کے تمام خس و خاشاک کے جلنے سے راہ گیروں کے لیے راستہ صاف ہو گیا ہے۔ یاد ثبت اسکاں کو ایک نقش پا سے تعبیر کیا ہے یا افراط شوق کو یوں ظاہر کیا ہے کہ شیشہ خود بشکن بر سر پیمانہ ما۔ آئے جانے کی یہ جلدی ہے کہ سایہ و سرخسہ یعنی طوبی و کوشر پر آرام گوارا نہیں بارا نہاں دار پر کہنا چاہتا ہے، اور منبر پر نہیں۔ اس کا مسلک یہ ہے کہ سر آستانے پر اور قدم بہت کدے میں۔ اعجاز نفس کا یہ حال ہے کہ دانے کی لاپچ میں گر قرار ہونے کو تیار نہیں بلکہ یہ چاہتا ہے کہ نفس کو اتنا اونچا کیا جائے کہ وہ اس کے آشتیاں تک پہنچ جائے مضبوط ہوش و خرد کا یہ عالم ہے کہ کمیش منان پر غلبہ حاصل ہونے کی امید نہیں تو اس کا مذہب اختیار کرنے کو تیار ہے کہ اس طرح شراب جو یہ میں نہ آئے گی تو یہ اور سوغات میں تو ضرور آئے گی۔ یا انسان کی بے بضاعتی اور مجبوری یہ کہ ہفت آسمان بگردش و ما دو میان او۔ دوسرے الفاظ میں قید حیات اور بندہ غم دونوں ایک ہیں اور جوش متناسے دیدار کا یہ حال کہ وہ آنسوؤں کی طرح پلکوں کے راستے سے ٹپکا جاتا ہے تاہم آرزوؤں اور ارادوں کا وہ ہجوم کہ معشوق سے کہتا ہے کہ تو آ۔ تاکہ آسمان کا یہ قاعدہ کہ وہ دوست کو دوست سے نہیں ملنے دیتا ہم دونوں مل کر بدل دیں اور حکم قضا کو رطل گراں کی گردش سے بھریں اور اختلاط کے موقع پر ہم دونوں ایسے زور زور سے سانس لیں کہ صبح کا دم بند کر دیں اور اس کو یکجائی کی اطلاع نہ ہونے دیں۔ یہ اور قسم کے خیالات، غائب کے یہاں بار بار ملتے ہیں جن میں زندگی کی حقیقتوں کا عرفان، اس کا نور و نکبت، جیسے کا سلیقہ اور حوصلہ سب ہی شامل ہے اور جو ان کے کڑے ہوئے ذہن اور پے ہوئے جذبات کا نتیجہ ہیں۔

میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ ان خیالات کی گونج اُردو اور فارسی کے دوسرے شاعروں کے یہاں مطلق نہیں سنائی دیتی۔ لیکن یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ یہ تیور، یہ رچاؤ، یہ انداز و اسلوب۔ یہ طرح واری، یہ نشاط معنوی دوسرے کے یہاں اس درجے میں نہیں ہے اور یہ بات اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کسی میں وسط ایشیا کی

ہم جوئی اور قوی العزمی ایران کی رنگینی و لطافت اور ہندوستان کی تاب و پیش ،
تحت الشعور میں ہم آئینہ ہو کر شعر کے قالب میں ڈھل جائے۔ غالب کو خود اس منہوی
دراشت کا پورا احساس تھا جو کئی واسطوں سے گزر کر ان کو ہندوستان میں ملی تھی۔ فرماتے
ہیں کہ قضا و قدر نے جو کچھ عرب کے فتوحات کے وقت ہم سے چھینا اس کے عوض میں مجھے
کہ میں بھی عجیب الاصل ہوں کچھ نہ کچھ دیا۔ جب آتش کدہ ایران جل کر راکھ ہو گیا تو مجھے آتش
کی جگہ نفس یعنی زبان دی اور جب بت خانہ ڈھک گیا تو مجھے ناقوس کی جگہ آہ و فغاں دی۔
شاہانِ عجم کے جھنڈوں کے موتی اتار لیے اور اس کے بدلے میں مجھے خامہ گنجینہ نشاں
عنایت کیا۔ اسی طرح ترکوں کے سر سے تاج لوٹ لیا اور مجھ کو شاعری میں لقبال کیا فی
رحمت فرمایا۔ موتی تاج میں سے توڑ لیے اور علم و دانش میں بجزویے یعنی جو کچھ
علی الاعلان ٹوٹا تھا وہ مجھے سے دے دیا۔ آتش پرستوں سے جو شراب جزویے
میں لے لی وہ مجھے ماہِ رمضان کی شب جمعہ کو بخش دی۔ خلاصہ یہ کہ جو کچھ پہنچی
میرے اہوا سے لونی تھی اس میں سے صرف مجھے زبان منسرباد کرنے کے
لیے بخش دی۔

مرزۂ صبح دریں تیرہ مشبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند
رخ کشوند و لب ہرزہ سرایم بستند
دل ربوند و دم چشم بگرا نم دادند
سوخت آتش کدہ ز آتش نفس بخشیدند
ریخت بتخانہ از ناقوس فنا نم دادند
گہر از رایت شاہانِ عجم برچیدند
بعوض خامہ گنجینہ نشانم دادند
افس از تارکِ ترکانِ پشتگی بردند
ہ سخن ناصیہ فر کیا نم دادند

گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند
 ہرچہ بُردند بہ پیدای بہ نہانم دادند
 ہرچہ در جزیرہ ز گبران بے ناب آوردند
 بشب جمعہ ماہ رمضانم دادند
 ہرچہ از دستگہ پارس بہ یغما بُردند

تا بنالیم ہم ازاں جملہ زبانم دادند
 یوں تو ہندوستان پر ایران کا اثر دارا (Darius) کے زمانے سے شروع
 ہوتا ہے لیکن مغلوں کے زمانے میں ترکی ایرانی دھارے مل گئے تھے۔ ہندوستان
 کی خصوصیات کی آمیزش نے اس تہذیب کا حسن ایسا نکھار دیا کہ آج
 دیکھ آئیے کو کبھی سمجھی کہ اللہ ری میں

غائب کے یہاں جو نشاط و مطالب کا قفس اور غفلت کا حسن ہے اس
 کا بھی سرچشمہ یہی ہے۔ ان کا انداز و اسلوب، ایرانی ہندی امتزاج کے
 اس نقطہ ارتقا کو ظاہر کرتا ہے جس کو تاریخ عرب سے ملے کر رہی تھی اور جس کا
 فن تعمیر میں سب سے خوب صورت اظہار تاج محل کے مرمیں اور میرا تراش
 جسم میں نظر آتا ہے۔ غائب کی شاعری، افسانہ نہیں ہے، اس میں
 نفسِ گرم کی آمیزش ہے۔ چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو ہے، خونِ جگر کی
 کی شہو ہے۔ انھوں نے میں نے خیالات دیے ان کے ادا کرنے کا ایک نیا
 اسلوب دیا اور سوچنے کے لیے حکیمانہ انداز اور جانچنے کے لیے تنقیدی شعور اس
 میں غفل قلم کی شگفتگی ہے، اس کا پُر معنی اختصار ہے، اس کا نزکاہ بانچہن ہے۔
 یہ انداز و اسلوب، حال اور مستقبل دونوں کے لیے اہم ہے۔

غائب کے نظریے حسن و عشق کی تعمیر میں بھی ان کی تمدنی وراثت، ان کی
 رنگارنگ شخصیت اور ان کی نسل اور ان کے خاندان کو بڑا دخل ہے۔ وہ محبوب
 کے وصل کو بہارِ تماشا کے گلستانِ حیات سمجھتے ہیں۔ دیو حرم کو آئینہ منکوارِ تمنا

اور پیشِ امروز کو زندگی کے لیے ضروری۔ انھوں نے جن سچائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ذہنی تحریک نہیں بلکہ تجربے اور جذبے سے بھرپور ہونے کے باعث، مجازی مادی اور انسانی ہیں اور یہ آپ کو معلوم ہے کہ مرزا غالب نے اس وقت، ہوش کی آنکھ کھولی جب مغلیہ سلطنت کی شمع بجھ رہی تھی۔ لارڈ الیک کی فوجیں دلی تک پہنچ گئی تھیں اور شہنشاہِ عالمِ عالمیان کی حکومت قلعہ معلیٰ تک رہ گئی تھی۔ مسلمانوں کی بغاوت میں یہ قصہ شہر بھی ختم ہو گیا۔ نہ وہ تدرج باقی رہا نہ وہ ساقی لیکن غالب، ان حوادث کو اپنے دریائے بیتابی کی ایک موجِ خوں سمجھ کر برداشت کرتے رہے اور اس ظلمت میں انھوں نے زندگی کو سنبھالا اور سنوارا بھی۔

غالب اس تہذیبی سلسلے کی کڑی ہیں جو ہمیں ازبکستان، ترکستان، تاجیکستان، افغانستان اور ایران سے ملاتی ہے اور یہی سبب ہے کہ جب حضرت پیر و مرشد ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے جشنِ غالب کی بین الاقوامی تنظیم میرے سپرد کی تو مجھے یونسکو پیرس میں ڈاکٹر طہ حسین، ازبکستان میں ڈاکٹر شاہ اسلام محمدوف، روس میں پروفیسر غفوروف، اطالیہ میں پروفیسر بوسانی، انگلستان میں مشرالفٹ رسل، چیکو سلواکیہ میں پروفیسر یان مارک، ایران میں آقاسے صورتگر، کناڈا میں پروفیسر عبدالرحمان یادگر اور امریکہ میں پروفیسر شیل کے ہمنوا بنانے میں مطلق کوئی دشواری نہیں ہوئی اور ان سب کو میں نے مشرق سے مغرب تک غالب کا طرہ دار ہی پایا۔

آخر وہ کیا چیز ہے جس نے غالب کو حلقہٴ شام و بحر سے نکال کر جاوداں بنا دیا؟ میرے خیال میں وہ یہی ایشیائی ورثے کا تسلسل ہے جو ہمیں غالب کی انسان دوستی، آفاقیت، وسیع المشرفی، درو مندی،

بے نیازانہ خوش طبعی اور معنی لفظِ آدمیت کی شکل میں از سر نو دستیاب ہوا ہے۔ یہ وہی مشرق کے شعور کی زوہے جو قدیم و جدید اور خواب و حقیقت کی وادیوں کے درمیان، بے پروائی اور رعنائی سے بہتی ہوئی اور نا آسودگی اور آرزو مندی کے گردابوں سے کیسلی ہوئی عالمی ادب کے ماورائی سمندر سے جا ملتی ہے۔

غالب کا مقدمہ پیش

غالب کے ذہن کو بچنے کے لیے اُن اقتصادی دشواریوں کو ضرور سامنے رکھنا چاہیے جو ۱۹۳۰ء سال (یعنی کم و بیش ۱۹۲۷ء) برابر مبتلا رہے اور جنہوں نے مرتے وقت تک ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ان مالی پریشانیوں میں اُن کے مقدمہ پیش کو خاص طور پر دخل ہے جس کی اصل شکل کا خلاصہ ہم پیش آرکائیوز نئی دہلی کے شکریہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

غالب کا مقدمہ پیش (خلاصہ شکل بخوروزہ پیش آرکائیوز نئی دہلی ۱۹۰۱-۱-۱۰۰)۔

ایک رجسٹر جس میں متعدد درپوٹیں داخل ہیں۔ (نہ شکل آرکائیوز۔ دہلی)

۱۔ چیف سکریٹری گورنمنٹ کی یادداشت، شام منری تقوینی پرنسپل سکریٹری گورنر جنرل آف انڈیا۔

اس کے ہمراہ چیف سکریٹری بمبئی گورنمنٹ کی چٹھی مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۳۳ء اور ریپڈنٹ

دہلی کا خط جس میں غالب کے مقدمہ پنشن کا خلاصہ درج ہے ارسال کیے گئے ہیں۔
خط میں لکھا، کہ کہ دائس پریزیڈنٹ اس بات سے اتفاق نہیں کریں گے کہ غالب کا خاندان
موجودہ پنشن سے زیادہ کا مستحق ہے۔

۲۔ مسٹر جان مالکم کی یادداشت بنام چیف سکریٹری۔

اس کے ہمراہ گورنروں کی تحقیقات کی تفصیلی رپورٹ کی نقل مورخہ ۲۴ نومبر ۱۸۶۳ء
ارسال کی گئی ہے۔ یہ تحقیقات اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ سند پر لارڈ لیک ہی
کے دستخط ثبت ہیں اور یہ کہ احمد بخش خاں کا چال چلن شک و شبہ سے بالاتر تھا۔

۳۔ مسٹر جارج مؤنٹین چیف سکریٹری کی یادداشت بنام ولیم دیکم ریزیڈنٹ دہلی۔

اس کے ہمراہ چیف سکریٹری بسٹی گورنمنٹ کے ایک مراسلے کی نقل بھی گئی ہے۔
مراسلے میں کہا گیا ہے کہ جس پردانہ پر لارڈ لیک کی مہر ہے دو صحیح معلوم ہوتا ہے نیز یہ
ہدایت کی گئی ہے کہ اس پردانہ کو نواب شمس الدین خاں کو واپس کر دیا جائے۔

۴۔ چیف سکریٹری گورنمنٹ کی یادداشت مورخہ ۱۹ اگست ۱۸۶۳ء غالب کے پنشن
کے معاملے کے بارے میں۔

اس میں کہا گیا ہے کہ نصر اللہ بیگ (بیگ) خاں نے جن نواب احمد بخش خاں الہی ریاست
فیروز پور کا داماد تھا۔ مرنے پر ماں ایک بیوہ تین بہنیں اور دو لڑکے (بھتیجے) چھوڑے
خواجہ حاجی نصر اللہ بیگ خاں کے باپ کی بیوی کی بھتیجی کا لڑکا تھا اور نصر اللہ
بیگ خاں کے معاملات کا انتظام اس کے سپرد تھا۔ اس کی (نصر اللہ بیگ خاں)
وفات پر نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے اپنی جائیداد کے متعلق پروانہ معافی
حاصل کر لیا۔ شرط یہ تھی کہ نواب احمد بخش خاں نصر اللہ بیگ خاں کے ورثہ کے
یہ دو معاش ہیا کرے گا۔ نواب نے ناجائز طور سے خواجہ حاجی کو متوفی کے خاندان
کا اہم ترین فرد بنا دیا۔ اور اس کے لیے دو ہزار روپیہ سالانہ اور باقی تین ہزار
سالانہ نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ اور غالب کے خاندان کی گزر اوقات کے
لیے مقرر کر ایسے۔ نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ کی وفات پر ان کا حصہ ان کی سبھی

بڑی بڑی کوتاہی جس نے اپنی دو چھوٹی بہنوں کی کفالت اپنے ذمہ لے لی۔ اس
انخام میں غالب کے بھائی مرزا یوسف کے لیے کوئی رقم نہیں رکھی گئی تھی۔
یادداشت میں غالب کے ۱۸۴۵ء میں کلکتہ جانے اور ۲۸ اپریل ۱۸۴۹ء کو
پرنسین سکرٹری کی خدمت میں اپنی عرضداشت پیش کرنے کا بھی ذکر ہے۔

غالب کا پنشن کیس

۷۸۹

فاریں ۱۸۳۱ء رڈ پارٹمنٹ پولیٹیکل

نیشنل آرکائیوز۔ دہلی

۲۲ اپریل نمبر ۱۰۸

غالب کی درخواست بنام جارج سونٹن سکرٹری پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ فورٹ ولیم
معرو ہے کہ مبلغ دس ہزار سالانہ پنشن کے لیے ان کے حق کو تسلیم کیا جائے اور یہ
رقم فروز پور کے جاگیردار کی جاگیر (جس کی مالیت مبلغ ۲۵ ہزار ہوتی ہے) پر واجب الادا
قرار دی جائے۔ وہ یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ وہ دستاویز جس کے اندر مبلغ ۵ ہزار دینا
ملے ہوئے ہیں اور جسے فریق مخالف (نواب احمد بخش خاں) کی جانب سے داخل کیا
گیا ہے۔ عرض گزار کے پنشن کا پورا حق پاتے ہیں (جو مبلغ دس ہزار سالانہ ہوتا
ہے) مانع نہیں ہونا چاہیے اور بہتر ہوگا کہ یہ پنشن براہ راست سرکاری خزانے سے
ادا کی جائے۔

غالب کا پنشن کیس

۱۰۹۳

نیشنل آرکائیوز، دہلی

کورٹ ریکارڈ بابت ۱۸۳۲ء کی نقل

موردہ یکم ستمبر ۱۸۳۲ء صفحات ۹۹۔ (نیز کچھ سادہ صفحے)

۱۸۳۲ء کا کورٹ ریکارڈ گورنمنٹ آف انڈیا کے مختلف افسران کی یادداشتوں
اور رپورٹوں پر مشتمل ہے جو غالب کے مقدمہ بابت اضافہ پنشن کے مختلف پہلوؤں کے
سلسلے میں مندرجہ ذیل حضرات کے نام ارسال کی گئی تھیں۔

- ۱۔ بنام مشر بنری تنوبی پرنسپ سکریٹری گورنر جنرل صفحات ۱-۳
- ۲۔ بنام چیف سکریٹری سپریم گورنمنٹ فورٹ ولیم صفحات ۵-۷
- ۳۔ چیف ریزیڈنٹ، دہلی صفحات ۹-۱۰ مورخہ ۳ اکتوبر ۱۸۳۲ء
- ۴۔ اسد اللہ خان کے مقدمہ میں چیف سکریٹری کا نوٹ صفحات ۱۳-۲۶
مورخہ ۱۹ اگست ۱۸۳۲ء
- ۵۔ بنام این بی ایڈمنشن اسکوائر صفحات ۲۹-۳۵ (نواب احمد بخش خاں کے حق میں فارسی پرواۃ کا انگریزی ترجمہ صفحہ ۳۵-۳۸)
- ۶۔ بنام ٹیننٹ کرنل مانگم۔
- ۷۔ بنام ایل۔ بی ایڈمنشن صفحات ۲۹-۵۲
- ۸۔ بنام جارج سونٹن چیف سکریٹری نو گورنمنٹ فورٹ ولیم صفحات ۵۳-۵۴
- ۹۔ پھٹی ہوئی فارسی دستاویز۔ خواجہ حاجی وغیرہ مرقوم ماہ جون ۱۸۳۲ء مطابق ۱۹ ربیع الاول ۱۲۳۲ء
- ۱۰۔ درخواست اسد اللہ خاں، بخدمت رائٹ آفیسر لارڈ ولیم ہنٹنگ گورنر جنرل ان کونسل کلکتہ۔ صفحات ۵۹-۶۳
- ۱۱۔ بخدمت لارڈ ولیم کیونٹس گورنر جنرل آف انڈیا صفحات ۶۵-۶۸
- ۱۲۔ بنام ایس فریزر۔ ڈپٹی سکریٹری نو گورنمنٹ پویشیکل ڈیپارٹمنٹ فورٹ ولیم صفحات ۶۹-۷۰ مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۸۳۲ء
- ۱۳۔ آخر میں "دستخط محمد اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں جاگیر دار سونگ سونا"۔ بخدمت لارڈ ولیم ہنٹنگ گورنر جنرل آف انڈیا فورٹ ولیم صفحات ۷۱-۷۲
- ۱۴۔ بنام سی۔ نورس چیف سکریٹری ٹوبیہ گورنمنٹ صفحات ۸۵-۸۶ مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۸۳۲ء
- ۱۵۔ بنام جارج سونٹن چیف سکریٹری نو گورنمنٹ۔ فورٹ ولیم صفحات ۸۹-۹۰
مورخہ ۲۷ نومبر ۱۸۳۲ء
- آخر میں "عہدداشت محمد اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں جاگیر دار

سونک سونا۔ بست و بفتح نومبر ۱۸۳۳ء

۱۶۔ بنام جارج سونٹنن چیف سکریٹری ٹو گورنمنٹ فورٹ ولیم۔ صفحات ۹۳-۹۴
مورثہ ۲۷ جنوری ۱۸۳۳ء

۱۷۔ از اسد اللہ خاں، بخدمت رائٹ آنریبل گورنر جنرل صفحات ۹۵-۹۸

غالب کا پنشن کیس

۷۹۱

نیشنل آرکائیوز، دہلی

فاریں- ۱۸۳۳- ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۱۳ اپریل ۸۰-۱

غالب کی درخواست بنام مسٹر سونٹنن چیف سکریٹری

یہ درخواست ان خدمات پر مشتمل ہے جو اہل برطانیہ کے ہندوستان پر قابض ہونے سے پیشتر ان کے باپ اور چچا نے انجام دی تھیں۔ موخر الذکر برطانوی حکمرانوں کی جانب سے آگرہ کا حاکم تھا۔ سائل اس بات کی درخواست کرتا ہے کہ جو واقعات اس نے اپنی عمر میں بیان کیے ہیں سرکاری ریکارڈ سے ان کی تصدیق کی جائے۔ تراں بعد اس سلسلے میں اسے ضروری سند (سرٹیفکیٹ) عنایت کیا جائے۔

۲۔ غالب کی درخواست بنام مسٹر سونٹنن چیف سکریٹری

اس میں کہا گیا ہے کہ ۳ مارچ ۱۸۳۳ء کو برطانوی حکومت نے ان پر چار سواروں کا چارج جو اس سے پیشتر اس کے مرحوم چچا کی کمان میں تھے۔ فیروز پور کے جاگیردار نواب احمد بخش خاں کو دیا تھا۔ وہ درخواست کرتے ہیں کہ فیروز پور کی جاگیر میں ان کے حق کی رقم کا تعین کیا جائے۔

غالب کا پنشن کیس

۷۹۳

نیشنل آرکائیوز، دہلی

فاریں- ۱۸۳۶- ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۵ دسمبر نمبر ۱۵۹-۶۱

۱۔ درخواست غالب بنام ڈبلیو ایچ میکنائن۔ سکرٹری پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ فورٹ ولیم چونکہ لفٹنٹ گورنر اگرہ نے ان کی درخواست کو از روئے شفقت ملاحظہ نہیں فرمایا اور گورنر جنرل نے ان کے فیصلے کو بحال رکھا ہے لہذا معروض ہے کہ سائل کے معاملے کو یا تو صدر دیوانی عدالت کلکتہ کے پاس منتقل کر دیا جائے یا انگلستان بادشاہ سلامت باجلاس کونسل کے حضور میں ارسال کر دیا جائے۔

۲۔ درخواست غالب بخدست لارڈ آف کلینڈ گورنر جنرل آف انڈیا۔ فورٹ ولیم سکرٹری پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ سے اس بات کی اطلاع پانے پر کہ ان کا دعویٰ خارج کر دیا گیا ہے غالب کی گورنر جنرل کے حضور میں معروض ہے کہ
۱۔ انہوں نے لفٹنٹ گورنر اگرہ کے فیصلے کے خلاف سات نکات کا اعتراض داخل کیا تھا اور درخواست کی تھی کہ ان کے جوابات ان سے (لفٹنٹ گورنر سے) مانگے جائیں۔

۲۔ اگر ان استفسارات کے جوابات آجائیں تو ان کی ایک نقل درخواست گزار کو مرحمت کی جائے لیکن اگر اس کی (جواب منگانے کی) ضرورت نہ سمجھی جائے تو ان کے بارے میں درخواست گزار کو مطمئن کیا جائے۔

۳۔ لہذا اب وہ ملتزم خدمت ہے کہ اس کے معاملے کو صدر دیوانی عدالت کلکتہ کے فیصلے کے لیے بھیج دیا جائے لیکن اگر عدالت کا فیصلہ اس کے خلاف ہو تو اسے ان وجوہ کے متعلق مطمئن کیا جائے جن کی بنا پر اس کا دعویٰ خارج کیا گیا ہے۔

۴۔ مزید برآں معروض ہے کہ اگر گورنر جنرل اس کے معاملے کو صدر دیوانی عدالت میں نہ بھیجے گا فیصلہ کریں تو اس معاملے سے متعلق جملہ کاغذات انگلستان بادشاہ سلامت باجلاس کونسل کے فیصلے کے لیے بھیج دیئے جائیں۔

ملفوظ جملہ کاغذات متعلقہ مقدمہ نیز مرقوم الصدور مکاتیب

نوٹ : اس درخواست کے جواب میں غالب کو سکرٹری پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کلکتہ کی جانب سے یہ اطلاع ملی کہ ان کے کاغذات کو رٹ آف ڈائریکٹرس کو بھیجے جا رہے ہیں۔

غالب کا پنشن کیس

۷۹۷

فاریں - ۱۸۳۷ - ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

نیشنل آرکائیوز - دہلی

۱۷ اپریل نمبر ۶۶ - ۶۷

۱۔ درخواست غالب بنام ڈپٹی ایچ میکناٹن سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا
فورٹ ولیم۔

معروض ہے کہ مبلغ ۲۰۳۰۰ روپیہ کا جو اس کا بقایا واجب الادا ہے مرحوم
شمس الدین خاں کے ترکہ کے مبلغ ۲۶۰۰۰ روپیہ میں سے جو گورنمنٹ کے پاس جمع ہیں
وضع کر لیا جائے اور شمس الدین خاں کی جائیداد کی فروختی سے سائل کا پھیل پنشن
کا بقایا محاسب مبلغ ۳۰۰۰ سالانہ تا اختتام اپریل ۱۸۳۷ء دلویا جائے نیز کورٹ
آف ڈائریکٹرز کے فیصلے تک اسے ۳۰۰۰ روپیہ سالانہ کی پنشن بلانا عہدہ ادا
کرائی جائے۔

۲۔ غالب کے خط کے جواب میں سکریٹری گورنمنٹ نے ان کے مراسلہ
قصیدہ فارسی کے بارے میں گورنر جنرل کی جانب سے اظہارِ خوشنودی کیا ہے۔

غالب کا پنشن کیس

۷۹۸ - ۸۰۰

فاریں - ۱۸۳۷ - ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۲۸ اگست نمبر ۹۳ - ۹۵

۱۔ مسٹر ایچ میکناٹن سکریٹری ڈپارٹمنٹ آف انڈیا کے نام غالب کا وضاحتی
مکتوب جس میں ان کے مقدمہ پنشن سے متعلق جو کورٹ آف ڈائریکٹرز کے
ذریعہ سماعت تھا کچھ مزید معروضات درج ہیں۔

۲۔ غالب کی درخواست بخدمت لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل ان کونسل فورٹ ولیم۔
(نعت) دو ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ جو پہلے خواجہ حاجی کو اور اس کے بعد اس کے

ورثا کو ملتا تھا اس کے خلاف اپیل ہے۔

ب : اگرچہ اس کے معاملہ سے متعلق تمام کاغذات داخل کیے جا چکے ہیں پھر بھی معاملہ کی صورت حال کا اختصار ضروری ہے اور مقرر ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ج : جبکہ چار سو سواروں کا رسالہ جر میرے چچا کی ماتحتی میں تھا توڑا گیا تو اس میں سے بچا سوار منتخب کر کے نواب احمد بخش خاں کی ماتحتی میں دے دیئے گئے بوخرا لڈ کر نے خواجہ حاجی کی خدمات کو جو قدیم رسالے میں سب سے پرانا افسر تھا برقرار رکھا اور اسے ان چچا سواروں کا افسر مقرر کیا۔ خواجہ حاجی محض ایک ملازم کی حیثیت رکھتا تھا جسے جملہ پندرہ ہزار سالانہ کی رقم میں سے جو سواروں کی نگہداشت کے واسطے منظور ہوئی تھی مبلغ دو ہزار روپیہ سالانہ کا الاؤنس ملتا تھا۔

خواجہ حاجی کی وفات پر اس کا منصب سابقہ شرائط کے مطابق اس کے لڑکوں کو دے دیا گیا۔ لیکن جب نواب احمد بخش خاں کی جاگیر ضبط ہوئی اور چچا سواروں کا رسالہ توڑ دیا گیا تب بھی تعجب ہے کہ خواجہ حاجی کے وارثوں کے لیے دو ہزار روپیہ سالانہ کا وظیفہ برقرار رکھا گیا۔ اگرچہ مناسب بات یہ تھی کہ خواجہ حاجی کے ورثا کو ان کے خاندان کی خدمات ثانیہ کے پیش نظر کچھ پنشن دے دی جاتی۔

د : مزید برآں اس کے میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے لیے جاگیر کی آمدنی مبلغ ۲۵ ہزار روپیہ سالانہ ملے ہوئے تھے۔ یہ پورے کا پورا وظیفہ میرے چچا کے وارثوں کو ملنا چاہیے تھا اور اس میں خواجہ حاجی اور اس کے وارثوں کا کوئی حصہ نہیں ہونا چاہیے تھا بشرطیکہ موجودہ فیصلہ لارڈ میک کی رپورٹ مورخہ ۴ مئی ۱۸۵۷ء کی بنیاد پر کیا جائے لیکن اگر گورنر آف ڈائرکٹرز کا فیصلہ فاری شفق پر مبنی ہو تب بھی میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے ورثا ہی پانچ ہزار روپیہ سالانہ پنشن کے مستحق ہیں۔ خواجہ حاجی کی زندگی میں مبلغ پانچ ہزار روپیہ سالانہ میں سے جو میرے چچا کے ورثا کے لیے مقرر ہوئے تھے اسے دو ہزار سالانہ کا وظیفہ دینے کی شاید کوئی توجیہ ہو سکے مگر اس کے وارثوں کو اس رقم

(مبلغ دو ہزار روپیہ سالانہ) پر استحقاق جتانے کا کوئی حق نہیں ہے کیوں کہ ان کا نصر اثربیک خاں کے خاندان سے جو اس خاندان کے مورث اصلی تھے کوئی تعلق نہیں ہے۔

لہذا معروض خدمت ہے کہ خواجہ حاجی کے وارثوں کا دو ہزار سالانہ کے لیے استقراء حق کا دعویٰ باوجود یفینٹ گورنر کے سابقہ فیصلے کے جو ان کے حق میں تھا نامنظور کیا جائے اور اگر انھیں کوئی وغیفہ ملنا ہی ہے تو وہ انھیں اصل پندرہ ہزار روپیہ سالانہ کی رقم میں سے دیا جائے جو رسالے کی نگہداشت کے واسطے مقرر ہوئی تھی۔

۳۔ ڈبلیو ایچ آئی فینٹنگ چیف سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا فورٹ ولیم کی رپورٹ بابت اس امر کے کہ نصر اثربیک خاں کے انتقال کے بعد کن وجہ کی بنا پر نواب احمد بخش خاں کو پندرہ ہزار روپیہ سالانہ کی رقم معاف کی گئی تھی۔

۴۔ فارسی شقلہ لارڈ لیک نے ۲۷ جون ۱۸۳۷ء کو لکھا تھا اور جس کے اندر نصر اثربیک خاں کے ورثا کو مبلغ پانچ ہزار روپیہ سالانہ وغیفہ دیا گیا تھا اور جس میں سے مبلغ دو ہزار روپیہ سالانہ خواجہ حاجی کے واسطے متعین کیے گئے تھے۔

۵۔ چیف سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کی چٹھی مورخہ ۲۸ اگست ۱۸۳۷ء بنام مرزا غالب جس میں انھیں بابت کی گئی تھی کہ آئندہ جلد درخواستیں اور کاغذات وغیرہ صرف یفینٹ گورنر آگرہ ہی کے توسط سے بھیجا کریں۔

غالب کا پنشن کیس

۸۰۳ - ۸۰۵

نیشنل آرکائیوز - دہلی

فائن ۱۸۳۲ - ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۲۹ جون - نمبر ۱۳ - ۳۰

۱۔ غالب کی چٹھی مورخہ ۲۰ مئی ۱۸۳۷ء بنام لی ایچ میڈوک چیف سکریٹری نو گورنمنٹ آف انڈیا - الہ آباد

معروض ہے کہ ملفوظ یادداشتیں جو اس کے اضافہ پیش کی درخواست اور قصیدہ فارسی (جس کے اندر گورنر جنرل کی مدح سرائی کی گئی ہے) کے متعلق ہیں۔ لارڈ ہسبندر کی خدمت میں پیش کر کے ان پر موصوف کے احکام حاصل کر لیے جائیں۔ غالب یہ بھی درخواست کرتے ہیں کہ حسب سابق آئندہ بھی انھیں اپنی معروضات اور خطوط براہ راست بذریعہ ڈاک بھیجنے کی اجازت دی جائے۔

۲۔ ملفوظ یادداشت مورخہ ۲۰ مئی ۱۸۴۸ء کی خدمت لارڈ ڈائرن گورنر جنرل آف انڈیا میں اپنے دعوئے اضافہ پیش سے متعلق خاص نکات پر زور دیا ہے اور عرض کیا ہے کہ ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں اپنی زندگی میں ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر پر جو انھیں برطانوی سرکار کی طرف سے مرحمت ہوئی تھی، قابض تھے اور اس کے بالعوض چار سو سواروں کا رسالہ تیار رکھتے تھے۔ ان کی رفات پر ان کی جاگیر حکومت نے واپس لے لی۔ اور رسالہ توڑ دیا گیا۔ پھر بھی لارڈ ڈیک نے اپنی رپورٹ مورخہ ۴ مئی ۱۸۴۸ء میں مرحوم کے خاندان کے لیے مبلغ دس ہزار روپیہ سالانہ کی پیش کی سفارش کی۔ اس رقم کی ادائیگی نواب احمد بخش خاں کے ذمہ کی گئی۔ غالب کا بیان ہے کہ نواب صاحب نے ان کے خاندان کو مبلغ دس ہزار سالانہ میں سے صرف تین ہزار روپیہ سالانہ دیے اور بعد میں نواب صاحب کے ورثا بھی یہی رقم دیتے رہے۔ شمس الدین خاں کے قتل کے بعد فیروز پور بھڑکھڑ کی جائیداد حکومت نے ضبط کر لی۔

۱۸۴۸ء میں مقدمہ اس وقت کے پریزیڈنٹ ڈبلیو۔ بی۔ ہیلے کے تصفیے کے لیے دائر کیا گیا اور چار سال بعد لارڈ ہینٹنگ نے اسے خارج کر دیا۔ ۱۸۴۸ء میں مرزا غالب نے اس معاملے کو پھر کورٹ آف ڈائریکٹرز کی نظر ثانی کے لیے پیش کیا۔ غالب عرض کرتے ہیں کہ پانچ سال گزر گئے مگر ہنوز کورٹ آف ڈائریکٹرز نے اپنے انقطاعی فیصلہ کا اعلان نہیں کیا۔ سائل اس بات کی بھی درخواست کرتا ہے کہ اسے اپنا پورا ادھیفہ لینے کی اجازت عطا کی جائے اور چونکہ نئے گورنر جنرل کو پچھلے گورنر جنرل کے مقابلے میں زیادہ اختیارات عطا کیے گئے ہیں، سائل کی درخواست کو شرف قبول

بخشا جائے۔

۳۔ فی ایچ میڈوک سکرٹری ڈیوڈنٹ آف انڈیا کی چٹھی بنام مرزا غالب۔
فی ایچ میڈوک لکھتے ہیں کہ :
پنشن اور وظیفہ وغیرہ کا فیصلہ سابق گورنٹ کرکچن میں جن کی کورٹ آف
ڈائریکٹرز نے پورے طور پر توثیق کر دی ہے۔ آخر میں یہ اطلاع دی ہے کہ لارڈ صاحب
اس موضوع پر کوئی اور درخواست قبول نہیں کر سکتے۔

غالب کا پنشن کیس

۸۰۶ - ۸۰۷
نیشنل آرکائیوز - دہلی

فائن ۱۸۴۲ - ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۶ جولائی نمبر ۱۳۲ - ۴۴

۱۔ غالب کی چٹھی مورخہ ۵ جون ۱۸۴۲ء بنام فی ایچ میڈوک سکرٹری ڈیوڈنٹ
آف انڈیا۔

درخواست کرتے ہیں کہ ملفوظ یادداشت کو مع اصل فارسی خط کے جو سکرٹری نے
گورنر جنرل کو بھیجا تھا مورخہ الذکر کے ملاحظہ کے واسطے پیش کر دیں۔ غالب یہ بھی کہتے ہیں کہ
ہنوز کورٹ آف ڈائریکٹرز کے یہاں سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

۲۔ ملفوظ یادداشت مورخہ ۵ جون ۱۸۴۲ء بمقام لارڈ ایلن براگورنر جنرل
فی ایچ میڈوک کی تحریر مورخہ ۳۰ مئی ۱۸۴۲ء کے جواب میں معاملہ زیر بحث کے
واقعات قلم بند کرتے ہیں جس میں (مسٹر میڈوک کی تحریر میں) اطلاع دی گئی ہے کہ اس
بارے میں اور کوئی درخواست برائے ملاحظہ منظور نہ کی جائے گی۔

غالب کہتے ہیں کہ چونکہ وہ سابقہ گورنٹ کے فیصلے سے مطمئن نہیں تھے اس لیے
انہوں نے لارڈ صاحب کے پیشرو سے درخواست کی تھی کہ ان کے معاملے کو کورٹ آف
ڈائریکٹرز کے ملاحظہ کے لیے بھیج دیا جائے۔ یہ استدعا ۱۸۴۳ء میں منظور ہوئی۔ دو
سال بعد غالب نے کورٹ آف ڈائریکٹرز کے فیصلے کے بارے میں دریافت کیا تو

انھیں اطلاع دی گئی کہ یہ معاملہ ۸ مئی ۱۹۴۲ء کو دہلی ہجج دیا گیا تھا۔ ۱۹۴۲ء تک کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ لیکن سکرٹری میڈوک کے خط سے معلوم ہوا کہ کورٹ آف ڈائریکٹرز نے سابق گورنمنٹ کے فیصلے کو بحال رکھا ہے غالب اب گورنر جنرل سے درخواست کرتے ہیں کہ اس فیصلے کی ایک نقل مع اس کی تاریخ کے انھیں مرحمت فرمائی جائے۔

۲۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز کی جنٹی مورخہ ۷ فروری ۱۹۴۲ء کا اقتباس :
 "اسد اللہ خاں کا دعویٰ مناسب وجوہ کی بنیاد پر خارج کر دیا گیا ہے۔"

یہ اقتباس غالب کو ایک وضاحتی چٹھی مورخہ ۵ مارچ ۱۹۴۲ء (جس پر فی ایچ میڈوک کے دستخط ہیں) کے ذریعہ بھیجا گیا۔

غالب کا پنشن کیس

۸۰۸ غایت ۸۰۹
 نیشنل آرکائیوز۔ دہلی

۲۸ دسمبر ۱۹۴۰ نمبر ۴۸۰-۸۳

۱۔ غالب کی جنٹی مورخہ ۲۹ جولائی ۱۹۴۲ء بنام فی ایچ میڈوک سکرٹری نو گورنمنٹ درخواست ہے کہ ملفوف عرضی کو گورنر جنرل کے ملاحظہ کے واسطے پیش کر دیں اور جرنل تاریخ کو یہ عرضداشت انگلستان ارسال کی جائے اس سے مطلع فرمائیں۔

۲۔ ملفوف درخواست بخدمت لارڈ ڈائلمن براگورنر جنرل مورخہ ۲۹ جولائی ۱۹۴۲ء درخواست ہے کہ کورٹ آف ڈائریکٹرز کے فیصلے کے خلاف اس کی درخواست اپیل کو بمبئی ملکہ منظرہ کے پاس روانہ فرمائیں۔

۳۔ فی ایچ میڈوک کی جنٹی مورخہ ۵ اگست ۱۹۴۲ء
 گورنر نے سائل کی عرضداشت کو کورٹ آف ڈائریکٹرز کے پاس پہلی ڈاک سے بھیجنا منظور کر لیا ہے۔

۴۔ مرزا غالب کی جنٹی مورخہ ۵ اگست ۱۹۴۲ء بنام فی ایچ میڈوک۔
 شکریے کے ساتھ مکتوب الیہ کی جنٹی مورخہ ۵ اگست ۱۹۴۲ء کی رسید دی ہے۔

غالب کا پنشن کیس

فاریں ۱۸۴۳ء - ڈپارٹمنٹ پرائیویٹ

۲۳ نومبر نمبر ۴۰-۴۱

- ۱۔ کورٹ آف ڈائریکٹرس کے مکتوب مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۸۴۳ء کا اقتباس جو غالب کو بھیجا گیا۔
”یہ یادداشت کمیشن برائے تحقیق احوال ہندوستان کے پاس بھیج دی گئی ہے۔“
- ۲۔ غالب کی چٹھی بنام آئی۔ کری سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا۔
معروض ہے کہ ملفوف یادداشت گورنمنٹ کے ملاحظے کے لیے پیش کر دی جائے۔

دستخط

رقیمہ نیاز امیدوار لطف اکرم

اسد اللہ

- ۳۔ غالب کی درخواست مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۸۴۳ء بحضرت سرمنٹری ہارڈنگ گورنمنٹ جنرل معروض ہے دو سال ہوئے کہ انھیں سرمنٹری ایچ میڈوک سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا نے مطلع کیا تھا کہ غالب کی یادداشت کورٹ آف ڈائریکٹرس کو بھیج دی گئی ہے لیکن ہنوز اپنے معاملے کے متعلق انھیں (غالب کو) اس کا جواب نہیں ملا۔
- ۴۔ فاریں ڈپارٹمنٹ فورٹ ولیم کی چٹھی مورخہ ۲۳ نومبر ۱۸۴۳ء
کورٹ آف ڈائریکٹرس کے یہاں سے کوئی راجب وصول نہیں ہوا اور یہ کہ ان کی موجودہ درخواست کی ایک نقل ان کے ڈائریکٹرس کے پاس بھیج دی جائے گی۔

غالب کا پنشن کیس

نیشنل آرکائیوز۔ دہلی

۸۱۲ - ۸۱۳

۲۹۱ - ۲۹۳

- ۱۔ غالب کی چٹھی بنام مشائخہ وردہ سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا۔
اس ملاقات کی یاد دہانی کی گئی ہے جو ان سے دہلی میں ہوئی تھی اور مزاج پرس کی

حکمتی ہے۔

۲۔ غالب کی جنسی بنام سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا۔

گورنر جنرل کے ملاحظے کے لیے اپنی درخواست کو ملفوف کیا ہے اور یہ امید کی گئی ہے کہ ان پر وہی کرم فرمائی جا رہی رہے گی جو مکتوب ایس کے پیشروؤں سائنٹسٹ پر منسوب اسٹریٹنگ میکناٹن اور میڈوک نے ہندول فرمائی تھی۔

۳۔ غالب کی درخواست بخدمت لارڈ ڈالین براگورنر جنرل۔

معروض ہے کہ گورنر جنرل کے دورہ الہ آباد کے موقع پر انھیں (غالب کو) بتایا گیا تھا کہ کورٹ آف ڈائریکٹرس نے گورنمنٹ آف انڈیا کے فیصلے کو بحال رکھا ہے اس پر انھوں نے (غالب نے) ایک اور اپیل سرجمشی ملکہ منغلہ کی خدمت میں روانہ کی تھی۔ ۵ اگست کو سائل کو مطلع کیا گیا کہ ان کا معاملہ انگلستان بھیج دیا گیا ہے۔ اسے ۱۸ جینیے گزر گئے لیکن انھیں کوئی جواب نہیں ملا۔ اس درخواست پر ۲۶ جنوری ۱۸۴۳ء کی تاریخ پڑی ہے۔

۴۔ سکریٹری گورنر جنرل کی جنسی مورخہ ۵ اگست ۱۸۴۲ء

اطلاع دی گئی ہے کہ غالب کی یادداشت اگلی ڈاک کے ذریعہ کورٹ آف ڈائریکٹرس کے پاس بھیج دی جائے گی۔

۵۔ مسٹر آئی کری سکریٹری گورنر جنرل کی جنسی مورخہ ۳ فروری ۱۸۴۳ء

اطلاع دی گئی ہے کہ ہنوز انگلستان کی سرکار کے یہاں سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ غالب نے ان دونوں مذکورہ اصدور جنسیوں کی نقول اپنی درخواست مورخہ ۲۶ جنوری ۱۸۴۳ء بخدمت گورنر جنرل کے ساتھ ملفوف کر دی تھی۔

غالب کا پنشن کیس

۸۱۵ - ۱۶

نیشنل آرکائیوز۔ دہلی

فائن ۱۸۵۶ ڈیپارٹمنٹ پریٹیکل

۱۹ دسمبر نمبر ۸۳ - ۵

۱۔ تحریر مورخہ ۸ دسمبر ۱۸۵۶ء بنام بی بی ایڈمنٹن۔ سکریٹری گورنر جنرل

آف انڈیا باجلاس کونسل فورٹ ولیم۔

ملفوظ درخواست اور مسئلہ کاغذات پیش کرتے ہوئے غالب التماس کرتے ہیں کہ انھیں گورنر جنرل کے ملاحظے کے واسطے پیش کر دیا جائے اور ازراہ نوازش اس کی غالب کو اطلاع دی جائے۔

قیمہ اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں

جاگیر دار سونگ سونا

مردم ہشتم دسمبر ۱۸۵۶ء عیسوی

۲۔ درخواست بخدمت جان وائیکاؤنٹ کیننگ گورنر جنرل باجلاس کونسل۔

غالب سر جارج کلرک کی ایک چٹھی اپنی درخواست کے ہمراہ ملفوظ کرتے ہوئے اس بات کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ آیا ان کا معاملہ ہر چٹھی ملکہ منظرہ کی خدمت میں ۷ اگست ۱۸۵۶ء کو ارسال کر دیا گیا ہے جیسا کہ انھیں اطلاع دی گئی تھی۔

عرضداشت اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں

جاگیر دار سونگ سونا

مردم ہشتم دسمبر ۱۸۵۶ء عیسوی

۳۔ نقل حکم گورنر جنرل

اس کے ہمراہ جارج کلرک کی چٹھی کو واپس کیا گیا ہے اور لکھا گیا ہے کہ جب کورٹ آف ڈائریکٹرس کا فیصلہ وصول ہوگا ۱۰ اس سے غالب کو مطلع کیا جائے گا۔

غالب کے چند غیر مطبوعہ فارسی رقعات

حضرت غمگین کے ناہر

مرزا غالب کے مکتوب ایہم میں حضرت غمگین کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ غالب نے ان کی رباہیات کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے ذوق کے کو آفتاب اور کوئی میں دریا کو بند کر دیا ہے اور ان کے دیوان رباہیات میں وہ مطالب پوشیدہ ہیں جو ششمنوی مولانا بروم میں بھی نہیں ملے۔ ان رباہیات کا خطی نسخہ مکاشفات الاسرارؒ انڈیا آفیس لاہور میں لندن میں موجود ہے۔ بلورم ہارٹ نے اس کا تعارف مندرجہ ذیل الفاظ میں کرایا ہے:

”یہ تیار علی دہلوی المعروف یہ حضرت جمی التھانس غمگین کی تصنیف اور رباہیات کا دیوان ہے۔ اس کے فارسی مقدمہ میں مصنف نے اپنے حالات لکھے ہیں، جن کی ابتدا ان کے اردو اشعار سے مونی ہے۔“

لے رقعات غالب و غمگین نقلی، غمگین اکادمی گوالیار خط نمبر ۱

لے مکاشفات الاسرار، انڈیا آفیس لاہور جی لندن نمبر ۱۱۵

لے قیمت حدود تالی خطوط ۱، انڈیا آفیس لاہور ہارٹ ص ۱۹، بطور ۱۹۳۶ء، نمبر مکاشفات الاسرار، نوازین ورنک ص ۱۱

ایک عمر ری میری اللہ کی جنگ دیتا میں را شکست ہو سو فرنگ
 غمگین مخلوب اب ہوا ہوں ایسا نہ فوج رہی نہ میں نہ وہ نام و ننگ
 فارسی مقدمے کی ابتدا کے الفاظ یہ ہیں :

”حامداً بعد حمد حقیقت و نعت صورت خود، سید علی عرف حضرت جی متخلص
 غمگین منوطن دلی قادری نقشبندی ابو العلاء المشرب مجلاً از احوال خود
 بغرض احباب صفوت انتساب می رساند۔“

شروع کی رباعیوں میں بسم اللہ کی تفسیر ہے۔ ابتدا کا شعر ہے :

بسم اللہ میں سب ہے جو کہ قرآن میں ہے
 قرآن میں وہ ہے جو کہ انسان میں ہے

(حضرت) سید علی دہلوی گوالیار کے ساکن تھے۔ ان کے والد کا نام سید محمد تھا۔ جو
 دہلی کے گورنر شاہ نظام الدین احمد قادری (تمیز نگین) کے بھتیجے تھے غمگین کے والد کا
 انتقال اس وقت ہوا جب اول الذکر کی عمر بارہ برس کی تھی۔ ۲۵ برس کی عمر میں درویشی
 اختیار کی اور سید فتح علی رضوی سے بیعت ہوئے۔ اس کے بعد گوالیار سے پٹنہ اور پٹنہ
 سے گلیا کا سفر کیا۔ گلیا میں ان کو حضرت شاہ ابوالبرکاتؒ کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔
 جن کے مشورے سے وہ بارہ برس تک پٹنہ میں رہے۔ یہاں انھوں نے خواجہ ابوالکھین
 سے فیض باطنی حاصل کیا اور ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ حضرت غمگین نے
 خواجہ ابوالکھین اور سید فتح علی دونوں کے سلسلے بھی بیان کیے ہیں :

”سکاشفات الاسرار کا یہ دیباچہ برہان پور میں لکھا گیا تھا حاجب غمگینؒ کی
 عمر ساٹھ برس کی تھی۔ اس کے آخر میں انھوں نے لکھا ہے کہ اس سے
 قبل وہ ایک دیوان مرتب کر چکے تھے جس میں ان کی زندگی کے کچھ حالات
 درج ہیں۔ اس کے بعض اشعار دیوان سکاشفات الاسرار میں شامل کر دیے
 ہیں جو انھوں نے مرزا اسد اللہ خاں غالب کے لیے مرتب کیا تھا۔ یہ
 نسخہ مصنف کا دستخط معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔“

یہاں بلوچ ہمارے نے غالب پر ڈیڑھ سڑی چاٹھے میں دو فاحش غلطیاں کی ہیں۔
 لکھا ہے کہ ان کا انتقال کلکتہ میں اور ۱۸۷۲ء میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں
 صحیح نہیں۔

مکاشفات الاسرار میں حضرت غمگین نے اپنے حالات لکھے ہیں۔ اس لیے
 دیباچہ اہمیت سے خالی نہیں۔ یہاں اس کے چند اہم حصے نقل کیے جاتے ہیں :

”بجلا از احوال خود بنفرض احباب صفوت انتساب می رساند کہ ایس فقیر ابن
 سید محمد بن سید احمد سید شاہ پیر بن سید محی الدین بن سید شیر محمد قادری کہ
 و در بان پور آسودہ اند و زیارت گاہ خلایق اند از اولاد سید محی الدین عبدالقادر
 جیلانی است رضی اللہ تعالیٰ عنہ و رحمۃ اللہ علیہم اجمعین و جدہ فقیر
 بنت خواجہ ابلی بن خواجہ بہاؤ الدین بن خواجہ عبداللہ المشہر بہ خواجہ
 نور محقق ابن خواجہ باقی باشند الحسنى المتخلص بہ برکت قدس اللہ اسرارہم است
 کہ در وہلی زیارت گاہ خلایق اند فقیر وہ از وہ سال بود کہ والدہم بعالم
 بقا رحلت فرمودہ بودند و گاہ گاہ ایس خیال می آمد کہ از کسے دوست حق
 بہ ہوندم تعلیم راہ حق از وہ حاصل نمایم۔ چوں بہ عربست و فرج سانگی
 رسیدم تحصیل علوم شغولی در زیدم و حنیکہ عمر بہ بست و نہد سانگی رسید
 شے در خواب دیدم کہ شخصی می گوید کہ ترا عم تو سید شاہ نظام الدین شیخ احمد
 قادری رحمۃ اللہ علیہ طلبند“

اس خواب کی تعبیر حضرت فتح علی شاہ گردیزی نے بیان کی اور فرمایا :

”کہ تعبیر اس خواب بہین است کہ ترا مبارکباد بہ روز جمعہ پیش ما آئی۔

پس روز جمعہ حسب ارشاد رسیدم و از دولت بہیت و رفقہ فالو گشتم“

میر فتح علی شاہ کی ہدایت کے مطابق غمگین پٹنہ میں حضرت خواجہ ابوالبرکات کی خدمت

لے مکاشفات الاسرار نسخہ لندن - دیباچہ

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ سید عیاسی مولانا ابورنگناضہ واسطو مطبع مفید عام لاہور ۱۹۰۷ء
 ص ۱۰۹

میں حاضر ہوئے اور انھوں نے پہلے وقت دو سلسلوں کی اجازت دی،
 "وقت رخصت مرا اجازت دو سلسلہ کے قادریہ و دیگر چشتیہ عطا فرمودند
 بعد ازاں فقیر در بلدہ گویا در چند سال در صحبت آں بزرگواران فائدہ پا
 ر بود۔"

اس دیباچے سے حضرت عکیمین کی ادبی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے،
 "از زمان سابق دیوان ریختہ گفتہ ہوم آں را دور کردم و الحال کہ عسرہ
 شصت سالگی رسیدہ امچو کہ واردات ہرمن غالب بودند موافق آں ہا
 دیوان دیگر در حالات و واردات و ذوق و شوق تحقیق و مجامی خود
 ترتیب دادم و بعضی غزلیات مخصوصہ دیوان سابق دریں دیوان
 لاحق مندرج ساختم و چون دیوان نو بہ اتمام رسید و واردات و
 غلبات و کیفیات بروم استیلا داشت خواستم کہ برائے برادر دینی
 عزیز از جان اسد اللہ خاں میرزا نوشہ متخلص بہ غالب واسد کہ دین
 زمانہ در نظم و شعر فقیر خود ندارند..... ترتیب دہم۔"

حضرت عکیمین نے مکاشفات الاسرار کی شرح بھی لکھی ہے جس کا نام مراتب حقیقت
 ہے۔ اس کی "شان نزول" یہ ہے:

"یک روز در باغ نشستہ ہونکہ ہمارا جہ عالی جاہ بہادر (دولت
 راؤ منڈھیا) برائے آں جناب (خواجہ ابوالحسن) تیار کنایہ سندہ بود،
 سخن (خواجہ ابوالحسن) فرمودند۔ کمال باریک۔ و از حاضران فرمودند کہ
 معنی امیں بیان کنید۔ بریک از یاران موافق استعداد خود عرض نمود۔
 فقیر را ہم گفتند کہ تو ہم چیزے بگو۔ من ہم موافق استعداد خود عرض نمودم۔
 دیدم کہ بہ چہرہ مبارکش بٹاشے پیدا آمدہ.... بعد پنج سال اسرار ہا در دل
 فقیر جوش آوردند کہ طاقت تحمل نہ اندنا چار یک دیوان ہفت صد غزل گفتم۔
 بائے قدرے تسکین حاصل شد۔ باز اسرار ہا در دل پیدا آمدن گرفتند۔"

بازیک و یوانی را با عیات آریب یک سزار و بیشتر ائید را بھی گفته شد و چند روز تمام مشایا اندم۔ بعد دوس سال بار اسرار با جوش آوردند و دوستان من نیز گفتند کہ (کسی) کتاب نثر باید گفت (؟) کہ تا اسرار و مسائل تصوف واضح شوند و بہ آسانی در فہم آیند و نام آں دوستان در دیباچہ نوشتہ ام۔ پس ایں کتاب نوشتہ شد۔ ایں سہ از برگشت زبان مبارک آں جناب است والا من آنم کہ من دانم ۛ

حضرت عکاتین نے ایک کتاب فغفل واشغال میں بھی لکھی ہے جو ارشاد الحیثی کے نام سے مشہور ہے۔ اس لیے کہ حضرت سید فتح علی گریزی کے ارشادات پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا نام جواہر نفیسہ ہے۔ اس کے دیباچے میں فرماتے ہیں :

”می گوید نقیر حقیر.... شرف اندوز پاہوس مخدومی میدی.... فتح علی حسین الرضوی الکر دیزی ثم الشاہ جہاں آبادی دام ظلہ.... خدم و بیعت نمود۔ شب در روز در خدمت شریف حاضری بردم و جبار و بکشی آستانہ متبرکہ می کردم.... و در عرصہ سی و یک سال آں سہ از زبان و درفشان ارشاد می شد آں را در صدف سینہ نگاہ می داشتم و می سپردم و طریزہ حافظہ اذکار و اشغال و مراقبہ و مشاہدہ و لطائف و مقامات وغیرہ ۛ

حضرت عکاتین کے حالات ان کی تصانیف کے علاوہ دوسرے بزرگوں کی ملفوظات میں بھی ملتے ہیں۔ کیفیت العارفین میں لکھا ہے :

”چوں حضرت قطب العارفین (حضرت ابوالبرکات) ہجوم خلایق بہ خود دیدند، و رآں زباں اکثر طالبان را در راہبہت تربیت یافتن باطن تقویٰ رض خلقت الرشید خود حضرت خواجہ ابوالحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ می نمود چنانچہ در آں روز سید علی شاد از گواہا طالب نعمت باطنیہ گشتہ بہ خدمت

ۛ مرات حقیقت، خطی نسخہ مملوکہ عکاتین اکادمی گواہا، ورق ۳۰۶
 ۛ جواہر نفیسہ (خطی) دیباچہ عکاتین اکادمی گواہا۔ اس کتاب کا نام ”تاریخ“ غریب ہے جس سے ۱۲۱۴ھ منطبق ہے (۱۸۹۹ء)۔

حضرت قطب العاشقین آمدہ تربیت یافتہ امیر شرف از خلافت از خواجہ
ابو الحسین صاحب، گرویدہ مراجعت بہ سمت گوالیار کردند۔ آں جا بعد
از دو سال حسب استدعای راجہ دولت راؤ سندھیا مع اخراجات
جہت رونق افروزی حضرت قطب العاشقین در شہر عظیم آباد آمدند و
برائے تشریف بری آں حضرت تذکرہ آوردند۔ از آں جا کہ حضرت
قطب العاشقین را رخت حشم و خدم و مزاج میچ نہ بود۔ از آں جا
صدائے نہ برخاست۔ الا خان الرشید آں حضرت خواجہ ابو الحسین صاحب
ایں امر را قبول نمودند.... و قتیکہ خواجہ ابو الحسین صاحب در گوالیار
رسیدہ.... متعلقان را نیز از شہر عظیم آباد طلبیدند۔ بعد از دو سال
حضرت قطب العاشقین نیز کہ خلف الرشید خود را از دیگر فرزندان عزیز تر
داشتند تاب مفارقت نیاوردہ.... خود مع دیگر لواحقان عزم
سفر سمت گوالیار برداشتند۔

یہ ماخذ سوانح غلیقین کے سلسلے میں اہم ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان سے نہ تو
تاریخ ولادت معلوم ہوتی ہے اور نہ تاریخ وفات۔ غلیقین اکادمی میں ایک وظیفے کی
کتاب ہے اس میں حافظ میاں عبدالرزاق عزت میاں میرزا علی التلخیص ہرزائی کے
قلم سے حضرت غلیقین کی تاریخ ولادت یکم صفر ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۳ء) اور تاریخ وفات
۳ صفر ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) لکھی ہوئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو وہ سابقہ بیانات کی رو سے
۲۹ سال کی عمر یعنی ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء میں بیعت ہوئے اور ان کی کئی ادبی زندگی کا
آغاز ۶۰ سال کی عمر یعنی ۱۲۳۷ھ (۱۸۱۳ء) میں ہوا۔

غلیقین کی وفات پر نواب مصطفیٰ خاں شہید نے ایک قطعہ تاریخ کہا ہے جس سے رزاق

کی تصدیق ہوتی ہے :

بہ عرف حضرت و غلغلیت تخلص
 بہ صورت سالک راہ طریقت
 شدہ مستید علی غنمہ رانی
 بہ معنی شاہ ملک کام رانی
 بدیدہ مجو دیدار حسدا بود
 بطویش دیدہ کھل البصیرت
 دلش چوں یافت ذوق رب ارنی
 بہ یک شبہ سوم روزہ صفر شد
 ز دل آہ کشیدہ شیفتہ گشت
 بہ برو او را صدائے لن ترانی

۱۲۹۸ھ / ۱۸۵۱ء

غلغلیت کا ذکر بعض تذکروں میں بھی ہے۔ عمدہ منتخبہ (تذکرہ سرود) میں لکھا ہے :
 ”غلغلیت تخلص۔ میرتید علی خلیف الرشید میرتید محمد مرحوم برادر زادہ حقائق و
 معارف آگاہ سید شاہ نظام الدین احمد قادری، ناظم صوبہ دار احمد ناز۔
 تشریح بزرگی و حسب و نسب محتاج بہ تحریر نیست۔ مرد بامروت و قابل
 است۔ از تصانیف اوست :

تو نے صیاد دنیا ظلم یہ ایسا دیکھا
 بال و پر تو در قفس سے مجھے آزاد کیا
 ترے ثانی اگر کوئی بشر ہووے تو میں جانوں
 بشر تو کیا اگر شمس و قمر ہووے تو میں جانوں
 ہجرتیں اس کے دل جینے سے میرا سیر
 لے لے جاں بہر خدا آجلد اب کیا دیر ہے
 دل اس کو دیا اب کیا تدبیر سے ہوتا ہے
 جو کام کہ ہوتا ہے تقدیر سے ہوتا ہے
 سولے تیرے ہیں کوئی یاد انگھوں میں
 پھرے ہے تو ہی تو لیل نہاد انگھوں میں

ملے چٹکریہ پیر زادہ ہاشمی میاں سید رضا محمد صاحب حضرت جی۔
 نے عمدہ منتخبہ (تذکرہ سرود) عکس نسخہ لکھا : ورق ۳۹۲

مہرباں کوئی مرا جز عسبم و لدار نہیں
 غس کا شعلے کے سوا کوئی خریدار نہیں
 مڑگاں کہے ہے اس کا گزیر ہے تو میں ہوں
 اور دل کہے ہے میرا پتھر ہے تو میں ہوں
 عشق میں رورو کے جو یہ داغ دل ملوث ہے شمع
 رشتہ الفت کو پروانے سے کیوں کھوٹی ہے شمع
 بلبل ہے اگر بہار سے خوش ہم اپنے ہیں گل عذار سے خوش
 دل کے لگ جانے کا یاروں سے کہوں کیا باعث
 ایک قصہ ہے جو تاحق میں کہوں کیا باعث
 عاشق ہوا ہے میرا یہ دل اس کی آن پر
 اشد کیسی آن بنی سیر سی جان پر
 اس ابر میں سے چٹا سنتوں کو جواز آیا

ساتی مع سے آیا مطرب مع ساز آیا
 عیار اشعار میں خوب چند دکھانے لکھا ہے :
 "میرزا علی غلین جو ان گرم اختلاط و خوش خلق و شگفتہ بیان، سعادت
 آفتاب، ستوہ اظہار، پر علم و حیا معلوم شد۔ بہ اصلاح سعادت یار خاں
 رنگین کلمہ ہائے اشعار آب و رخسار را رنگ و بو سے تازہ بخشندہ ہر سگی
 دیوان معروف و نظر اس فقیر انواع المعانی و در آمدہ۔"

اس کے بعد نمونہ یہ سات شعر دیے ہیں :
 مرا اس عشق کی دولت سے چہرہ ارغوانی ہے
 نکلتا ہے جواشک آنکھوں سے میرا ارغوانی ہے
 میرے عیا دنیا ظلم یہ ایجا و کیا
 بال و پر تو ز قفس سے بچے آزاد کیا

لے عیار اشعار، عکس محفوظ لندن۔

اور نہ کوئی مزاج غم و لہر نہیں خسر کا شے کے سوا کوئی خرید نہیں

یہ داغ عشق نہ ہو دور اپنے سینے سے
کہیں شاہ کداحرف بھی بیچنے سے
گو یہ بخت ہوا پر سر نہ بینائی ہوں جو کہ دیکھے ہے سوا کھوں کا آج ہے مجھے
مضطرب تھا دل اپنا جوں پارا
آخر اس شوخ نے جہا مارا

ایک مدت رہے (ہم) عشق بتاں میں غمگین

بعد ازاں کعبہ کو بھی کر کے معشرہ دیکھ لیا

مسرور اور دکا کے تذکروں میں جن اشعار کو منتخب کیا گیا ہے وہ موجودہ دیوان غمگین
میں نہیں ہیں۔ اس لیے قرینہ غالب ہے کہ یہ اشعار اس دیوان اول کے ہیں جو ۱۱۹۰ھ سے
پہلے ترتیب دیا گیا تھا اور جو بیعت کے بعد غمگین نے خود ہی مسرور کروا تھا۔

غمگین کا ذکر مجوزہ لغز میں بھی ہے۔ اس کا یہ اقتباس دل چسپی سے خالی نہ ہو گا:
”غمگین متخلص... جو انے نیک زندگانی، کشادہ پیشانی، خوش اختلاط مستحکم

ارتباط، یار اش، محبت، تلاش، بخل، نواز، مخافت، گداز، اعز و کمین شاگرد

سعادت، بارخاں، رنگین است۔ بلی قدر حال خطا فسق، کذا می نوید، کم کم

فکر سخن می گزیند۔ خوش زندگانی می کند و با قریح و مسرور، ایام بے بدل جوانی

بکام دل، بسر می برد۔ بہر حال اس چار بیت منسوب بدوست :

(۱) میرے صیاد نے کیا ظلم الخ

(۲) یہ داغ عشق نہ ہو دور الخ

(۳) میرا اس عشق کی دولت سے

(۴) گو یہ بخت ہوں پر سر نہ بینائی ہوں

جو کہ دیکھے ہے سوا کھوں سے لگا آج ہے مجھے

اس شعر سر قہار اب کلیم است۔ اما بہ زبان خود خوب غفر ہے

جاس رنگین میں غمگین کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے غمگین کو اپنا شاگرد لکھا ہے اور اپنی وہ غزل وی ہے (مان کر۔ جان کر) جو انھوں نے جرات کی زمین میں غمگین کی فرمائش پر فی البدیہہ کہی تھی۔ دوسرے موقع پر غمگین کے وہ شعر نقل کیے ہیں جو انھوں نے ڈھاکہ میں چند دوستوں کے سامنے اور ایک سنی کی سواری کے دوران میں پڑھے تھے۔
 غمگین نے بھی رنگین کی اسادہ کا اعتراف کیا ہے قطعہ تاریخ میں لکھا ہے :
 جب اسادہ رنگیں جہاں سے گئے تو ایک یادگاری رہی رخصتی
 خرد نے کہا یہ ہی تاریخ ہے کہ ساتھ ان کے غمگین گئی رخصتی

۱۲۵۱ء / ۱۸۳۵ء

غمگین کا ترجمہ کریم الدین، نساخ، شیفٹہ اور عبدالحی صفائی نے بھی دیا ہے لیکن کوئی نئی یا خاص بات نہیں نکلی۔ سید فتح علی گرویزی کے تذکرہ ریختہ گویاں میں انھوں نے شعرا کا ذکر ہے لیکن غمگین کا ذکر نہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے مؤرخانہ ذکر کا شمار اسادہ میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ نواب الہی بخش خاں معروف نے بھی غمگین سے مشورہ سخن کیا تھا۔

۱۔ جاس رنگین : نظای پر میں لکھنؤ ص ۱۰

۲۔ جاس رنگین ص ۶۲

۳۔ مخزن الاسراء علی : غمگین اکادمی گواہار

۴۔ تذکرہ کریم الدین، ص ۱۹۰ و ۱۹۱ (طبقات دوم) طبع دہلی۔ ۱۸۳۵ء

۵۔ نساخ : سخن شعرا، ص ۳۵۳، طبع نول کشور

۶۔ شیفٹہ : گلشن ہے غلہ، ص ۱۳۳، طبع نول کشور

۷۔ صفائی : شمیم سخن، ص ۱۰۷، طبع ادارہ الہند، مراد آباد

۸۔ تذکرہ ریختہ گویاں، مرتبہ ڈاکٹر عبدالحی، مطبوعہ اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء

۹۔ مقدمہ دیوان ذوق، محمد حسین آزاد

غالب کا سگّہ شعر

۱۸۵۷ء کی بغاوت میں مرزا غالب پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ وہ ”باغیوں“ سے اخلاص رکھتے تھے اور انھوں نے بہادر شاہ کی شہنشاہی کے اعلان پر جواڑی مٹی ۱۸۵۷ء کو ہوا، ایک سگّہ شعر بھی کہا تھا۔ اس کا ذکر انھوں نے تفصیل سے ایک خط میں کیا ہے جو حسین مرزا کے نام ہے اور ۱۸ جون ۱۸۵۹ء کا لکھا ہوا ہے :

”اب میرا دکھ سنو، بھاگا نہیں، پکڑا نہیں گیا، دفترِ قلعہ سے کوئی میرا کافہ نہیں کسی طرح کی بے وفائی و نہک حرّانی کا دھتیا بھڑ کو نہیں لگا۔ یہاں ایک اخبار جو گوری شنکر یا گوری دیال یا کوئی اور غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا، اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ غلامی تاریخ اسد اللہ خاں غالب نے یہ سگّہ کہہ کر گزرانا ہے :

ہر زرد سکہ کشورستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی
مجھے عزیز الملاقات صاحب کشتی نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے۔ میں نے کہا کہ غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر غلام

خدا جانے کس نے کہا۔ اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہہ کر گزرانا ہوتا تو دفتر سے وہ میرے ہاتھ کا کھٹا ہوا گزرتا اور آپ چاہتے حکیم حسن الشیخاں سے پوچھتے۔ اس وقت تو چپ بورڈ۔ ۱۔ جو اس کی بدلی ہوئی تو جانے سے وہ جتنے پہلے ایک فارسی رو بیکارہ لکھوا لیا کہ یہ جو اسد الشیخاں فارسی کے علم میں یکجا مشہور ہے، اس سے کام نہیں نکلتا۔ یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اس کا سکہ لکھا، ہمارے نزدیک سائنس کے پانے کا مستحق نہیں ہے

یوسف مرزا کو دعا پہنچے۔ بھائی یہاں منشی برہمہ حسین ولد روشن علی خاں نے مجھ سے کہا کہ حضرت! جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو میں مرشد آباد میں تھا۔ وہاں میں نے یہ سکہ سنا تھا، ان کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبر وفات اکبر شاہ و جلوس بہادر شاہ چھپائی تھی، وہاں اس سکہ کا گزرتا ذوق کی لہرت سے چھاپا تھا۔ اور جلوس بہادر شاہ اکتوبر کے پہلے ۱۲۸۳ھ یا ۱۲۸۲ھ میں واقع ہوا ہے۔ بعض صاحب اخبار جمع کر رکھتے ہیں، اگر وہاں کہیں اس کا پتا پاؤ گے اور وہ اخبار اصل بجنہ مجھ کو بھجواؤ گے تو بڑا کام کرو گے۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) جو سکہ غالب سے منسوب کیا گیا وہ یہ ہے۔

بہ زرد سکہ کثورستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی

(۲) غالب اس کی تصنیف کے منکر ہیں اور اسے ذوق کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

(۳) غالب کے خیال میں یہ سکہ بہادر شاہ کی تخت نشینی کے وقت ۱۲۸۳ھ یا ۱۲۸۲ھ

میں کہا گیا تھا۔ یہ مرشد آباد تک مشہور تھا اور دہلی اردو اخبار میں چھپ چکا تھا۔

اسی لیے غالب کو اس اخبار کی تلاش تھی۔ چودھری عبدالغفور سرور کو ایک خط

میں لکھتے ہیں،

لے ملو کہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، عکس ذمہ شمول علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۱۹۳۸ء

جناب چودھری صاحب آج کا میرا خط کاٹ گدائی ہے۔ یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں۔ تفصیل یہ کہ مولوی باقر دہلوی کے مطلع میں سے ایک اخبار ہر مہینے میں چار بار نکلا کرتا ہے، سبھی بدلتی اور دو اخبار۔ بعض اشخاص سینن ماضیہ کے اخبار جمع کر رکھا کرتے ہیں۔ اگر اچھا نا آپ کے یا کسی آپ کے دوست کے ہاں جمع ہوتے چلے آئے ہوں تو اکتوبر ۱۸۵۳ء سے دو چار مہینے کے آگے کے اوراق دیکھنے جائیں جس میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر اور میاں ذوق کے دو سکنے ان کے نام کے کہہ کر بذر کرنے کا ذکر مندرج ہوئے تکلف وہ اخبار چھاپے کا اصل بجنب میرے پاس بھیج دیجئے گا۔

چودھری عبدالغفور اس پرچے کے حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ ان کو لکھتے ہیں: ”آپ کی سنی اور اپنی ناکامی پہلے سے میرے دانش اور خاطر نشان ہے جیسا کہ کوئی استاد کہتا ہے۔“

تہی دستا قیامت، ماہ سودا زر مہیکر کامل کو خضر آپ جواں آشنی آر دسکندرا
وہ اخبار نہ کہیں سے آتا آیا اور نہ آئے گا۔ میں اپنے خدا سے امیدوار ہوں کہ میرا کام بغیر اس کے نکل جائے گا۔

اگلے خط میں پھر اسی کا ذکر ہے اور اس کا افسوس ہے کہ یہ الزام کسی طرح دور نہ ہو سکا: ”سکے کا دار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب، کس سے کہوں، کس کو گواہ لاؤں۔ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ دو سکے کہہ کر گزرا نہ۔ بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر جو ذوق کے معتقدین میں تھے، انھوں نے دلی اور دو اخبار میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس کے علاوہ اب وہ لوگ موجود ہیں کہ جنھوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتہ میں یہ سکے ٹسے ہیں اور ان کو یاد ہیں۔“

اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرائے ہوئے ثابت ہوئے۔ میں نے ہر چند فکر و ہند میں ولی اردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈنا کہاں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر رہا۔ فیشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان غلٹ دور بار بھی مشاخیہ کچھ ہوا چونکہ موافق رضا ہے، ابھی ہے، اس کا گلہ کیا ہے چوں جنبش سپہرہ قربان داود راست
بیدار ہو دو آنچہ بہا آسمان دہرہ

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :

”وہ دہلی اردو اخبار کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مفید مطلب ہے“ اور ذخیرہ کچھ محل خوف و خطر نہیں ہے۔ حکام صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ میں نے سکہ کہا نہیں اور اگر کہا تو اپنی جان و حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں۔ اور اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ! گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانا اور جنگ گھر اور میگزین کا ٹوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں !

سوال یہ ہے کہ غالب کے ”وہ“ دو مصرعے کون سے تھے؟ تھے بھی یا نہیں؟ ہمارا خیال ہے کہ جو سکہ غالب کے نام سے مشہور ہوئے وہ درحقیقت ان کے نہیں تھے اور اس معاملے میں ان کا اضطراب بجا تھا۔ لیکن انھوں نے سکہ بھی کہا تھا اور قصیدہ بھی گزرائے تھا، اس طرح ”باغیوں“ سے اخلاص کی بات بالکل نظر انداز کرنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ اس کے اعادے میں بھی مضائقہ نہیں کہ جو سکہ میں نے دریافت کیا ہے وہ غالب کے انکار کی بنیاد نہیں ہے اور نہ وہ ان کے کسی خط میں معرض بحث میں آیا ہے۔

معین الدین حسن خاں نے خدنگب خدر میں لکھا ہے کہ کھنولے مرزا عباس نزد

لے اردوئے معلیٰ، مطبوعہ ۱۸۹۵ء، ص ۱۰۳-۱۰۴

لے خطوط غالب مرتبہ مولوی حبیب اللہ، ص ۱۵۶

لے مکس ملوکہ راقم۔ یہ کتاب شہزادہ اردو، دہلی پبلشرز کی طرف سے شائع ہو چکی ہے

لائے، جس میں باؤشاہ کے نام کی اشرفیاں تھیں اور جن پر یہ شعر کندا ہوا تھا،
 بہ زرد زو سکے نصرت طرازی سراج الدین بہادر شاہ غازی
 یہاں ایک جملہ معترضہ ضروری ہے، مشکات نے خدنگ ندر کے انگریزی
 ترجمے میں سورج الدین لکھا ہے، اس کے علاوہ اس میں ترجمے کی بے شمار غلطیاں ہیں،
 خواجہ حسن نظامی نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر دیا ہے اور اصل متن نہیں دیکھا۔
 مشکات کا ترجمہ غلط اور خواجہ حسن نظامی مرحوم کا غلط اور غلط ہے۔

ممکن ہے یہ سکہ (بہ زرد زو سکے کشورستانی + سراج الدین بہادر شاہ ثانی)
 بہادر شاہ کی تخت نشینی (۱۷۵۷ء) کے وقت کا ہو اور بعد میں "کشورستانی" کے
 بجائے نصرت طرازی اور "ثانی" کے بجائے غازی کے الفاظ سنہ ستاون کی
 جہد آزادی کے پیش نظر بدل دیے گئے ہوں۔ اس میں اور غالب کے نقل کردہ سکہ
 میں اصل فرق یہی ہے، اس کا مصنف کون ہے؟ یہ کہنا مشکل ہے، لیکن جیون لال
 معین الدین جن خاں دو فوں نے اسے ایک ہی طرح لکھا ہے اور کسی نے اسے غالب
 سے منسوب نہیں کیا، پوری خدنگ ندر میں صرف ایک جگہ غالب کا ذکر ہے، وہ
 بھی ان کے بھائی کے ذیل میں بنگالہ جرنیل کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

"محلہ کھڑکی فراش خانہ میں مولوی فرید الدین صبح کی نماز پڑھتے ہوئے مسجد
 میں بلائے گئے، حکیم خانی الدین خاں وحکم احمد حسین خاں بھی اسی طرح مع اپنے
 قاتلوں کے ملک، عدم کو دست و گریبان روانہ ہوئے، مرزا یوسف برادر خورد
 اسراشد خاں غالب کہ قدیم سے جمنون تھے، حالت جمنون میں مگر سے باہر
 نکل کے چلنے لگے، وہ بھی مارے گئے اور کئی آدمی آپر (و) دار، نامی اس
 بنگالہ جرنیل میں معروض قتل میں آگئے۔"

۱۷ TWO NATIVE NARRATIVES OF THE MUTINY IN DELHI
 TRANSLATED BY G.T. METCALFE, 1878, PAGE 67.

۱۸ قندک مسجد و شام، مجبور و سہروردیس دہلی (۱۹۲۶ء) مرتبہ مولوی ضیاء الدین برقی
 ۱۹ خدنگ ندر محفوظ بقلم مصنف، اورتی ۱۰۴۰ الف۔ عکس منظر کا رقم۔

مشکات نے جیون لال کے روزنامے کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بھی بہت سی فاحش غلطیاں ہیں۔ اس ترجمے میں غالب کا شکہ نہ اردو ہے لیکن اصل روزنامے میں موجود ہے۔

خشخشی جیون لال کے الفاظ یہ ہیں :

”انیسویں مئی ۱۸۵۷ء“

دربار شاہی منعقد ہوا مولوی ظہور علی تھانہ دار نے حاضر ہو کر ایک سکہ جلوس

در بابت تخت نشینی حضور گزرا نا۔ سکہ شعر :

سکہ زو بریم دزد دہند شاہ دیں پناہ ظلی سبحانی سراج الدین بہادر شاہ (کذا)

اس پر اور شاعروں نے بھی سکے کہے۔ سکہ شعر :

سکہ صاحب قرانی زو بتائید الہ سایہ یزداں سراج الدین بہادر شاہ (کذا)

(ورق ۳۸ ب) دیگر سکہ شعر :

سکہ صاحب قرانی زو بتائید الہ ظلی سبحانی سراج الدین بہادر شاہ

دیگر سکہ شعر :

بزر زو سکہ نصرت عرازی سراج الدین بہادر شاہ غازی

دیگر سکہ شعر۔ مرزا نوشہ سے

بر زو آفتاب و نعت سہ ماہ سکہ زو در جہاں بہادر شاہ تھے

مشکات نے اس عبارت کا ترجمہ کہ ”مولوی ظہور علی تھانہ دار نے حاضر ہو کر

ایک سکہ جلوس در بابت تخت نشینی حضور گزرا نا۔ الخ“ اس طرح کیا ہے۔ اصل کے

ساتھ بقول اٹالیوں کے غدا رہی ہے۔

لے جیون لال روزنامہ آندھ تلکس ملوکہ راکم۔ سکہ روزنامہ خشخشی جیون لال اصل سکہ ملوکہ مشکات ورق ۳۸

اے۔ وپ تلکس ملوکہ راکم۔ سکہ مشکات نے یہ غلطی کی۔ یہ سکہ نکالی ہے۔ سکہ جلوس ۱۰ اور۔ دیگر سکہ شعر کا ترجمہ

منفک خبر ہے۔ اس سے لہذا مفہم بدل گیا ہے (مشکات کا ترجمہ ص ۹۹) خواجہ حسن نظامی نے تھانہ دار مولوی علی تھانہ دار

بھی حاضر تھے اور انھوں نے مذکر کے طور پر چند خرفیاں پیش کیں۔ سکہوں پر یہ الفاظ کندہ تھے۔ سکہ زو بریم دزد الخ۔

دوسری جانب حسب ذیل عبارت درج تھی : سکہ صاحب قرانی الخ : علامہ جو غدر کی صبح دشنام ص ۱۱۳۔

MOLVI JAJJAR ALI (۴) THANADAR ATTENDED AND PRESENTED A SICCA OF GOLD MOHUR AS TRIBUTE MONEY. ON THE COINS WERE INSCRIBED ON THE REVERSE:

سکہ نذر ہر سیم وزر ۱۶

سکہ صاحب قرائی نذر ۱۶

منشی جیون لال کی روش غالب کے ساتھ مواخذہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ شعر ہے

بروز آفتاب و نعت سترہ ماہ سکہ نذر در جہاں بہادر شاہ

خود پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس کا مصنف غالب کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اب تک مختلف شاعروں کے ساتھ کئے گئے سلسلے آئے ہیں لیکن اس "قدِ دلکش" کے ساتھ کوئی بھی نہیں آیا۔

غالب نے ایک قصیدہ بھی اس زلزلے میں فتح آگرہ کی خوشی کے موقع پر پیش کیا

تھا، اگرے کے اخبار عالم تاب میں لکھا ہے کہ "مرزا نوشہ اور سکرم علی خاں نے ۱۳

جولائی ۱۸۵۷ء کے دن بہادر شاہ کی تعریف میں قصیدے پڑھے تھے۔" اس کی بھی تائید

منشی جیون لال کے روزنامے سے ہوتی ہے۔ ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کے ذیل میں لکھا ہے:

(فتح آگرہ کے مزوے سے سب بادشاہ و اہل قلعہ خوش تھے) مرزا نوشہ اور

سکرم علی خاں نے ایک قصیدہ من تصنیف خود بادشاہ کی مدح میں پڑھے۔

غالب کے ایک شاگرد — مولانا بیدل

مرا وہی مولانا عبدالمصمیم بیدل سے۔ تلامذہ غالب میں ان کا سرسری ذکر ہے۔ اس ترجمہ میں نہ تو ان کی پوری تصانیف کا احاطہ کیا گیا ہے اور نہ ان کی کوئی غزل درج کی گئی ہے بلکہ حالاتِ غالب سے ان کے معنوی تعلق کا اصلی سرچشمہ یہی ہے۔ تلامذہ غالب کی یہ بات بھی قرینِ صحت نہیں کہ بیدل کی ”نورِ ایمان“ میں ”مسائلِ دینی“ نظم کیے گئے ہیں۔ (یہ دراصل نعتِ شریف میں ایک رسالہ ہے جس کا دیباچہ شعر میں اور اصل رسالہ نظم میں ہے) یہ اطلاع بھی صحیح نہیں کہ نورِ ایمان کے دیباچے میں عبدالمصمیم بیدل کے یہ اشعار ”دوستو بے دار فانی چند روز“ درج کیے گئے ہیں۔ ہمارے سامنے نورِ ایمان کا وہ نسخہ ہے جو شرفِ المطالع میرٹھ سے شائع ہوا تھا۔ اس میں یہ اشعار کہیں بھی موجود نہیں۔ اور دیباچہ تو ازاول تا آخر شعر میں ہے۔ اس میں ایک مصرع بھی نہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا ہے اس کا کوئی دوسرا ایڈیشن بھی ترمیم کے ساتھ شائع نہیں ہوا۔ ان وجوہ سے لگان

سہ تلامذہ غالب (ہلک دم) ص ۵۲ سہ ایضاً سہ ایضاً

نگار نورِ ایمان مطبوعہ شرفِ المطالع، میرٹھ ۱۳۴۱ھ (۱۹۲۱ء)

ہوتا ہے کہ صاحب تلامذہ غالب نے نور ایمان کو ملاحظہ نہیں فرمایا، کسی اور ذیلیے سے معلومات اخذ کی ہیں۔ ورنہ وہ اس کے مندرجات سے ہمیں صحیح طور پر مطلع فرماتے اور اس کے صفحہ، مطبع اور ایڈیشن کسی چیز کا تو حوالہ دیتے۔ اس کے علاوہ مولف موصوف و عبد السمیع بیدل کی کلمہ دو کتابوں کو ”موجود“ بتاتے ہیں، حالاں کہ اس وقت ان کی دس تصانیف ہمارے سامنے موجود ہیں جو صوبہ کونہ بختیا شمس الدین صاحب رئیس میرٹھ کی ہربانی سے حاصل ہوئی ہیں۔ مؤرخ الذکر مخدومی خان بہادر شیخ بشیر الدین صاحب مرحوم و مغفور کے چھوٹے صاحبزادے ہیں اور خان بہادر صاحب، بیدل کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ مگر یا شاگردی کے لحاظ سے غالب کے پوتے تھے۔

نور ایمان کا دیباچہ اس طرح شروع ہوتا ہے :

”عبد السمیع بیدل اور اللہ رسول کی صفات ! وہی مثل ہے چھوٹا سند بڑی بات۔
اس زبان کشف کو اُس نام لطیف سے کیا مناسبت۔ خاک کو عالم پاک سے کیا
نسبت۔ بھلا جس کا بال بال غطاؤں میں بھرا ہوا ہو۔ اس سے یہ پاک عمل سرسبز
صواب کیونکر ہوا۔ لیکن کیا کیجیے پتہ نہیں پڑتا کہ یہ نام نہ لیجیے کبھی دل اور زبان
کو اس نام سے جھل، یا جاتا ہے کہ لا الہ الا اللہ اور کبھی روح پرواں کو ہاں
نام سے تازہ کیا جاتا ہے کہ تَحْسَنُ رَسُوْلُ اللہ پر سہر کر بھی دو نام۔ ان ہی دو
کی اطاعت سے اہل ایمان کا حسن انجام :-

مولانا بیدل ^{۱۲۸۵ھ} ۱۸۶۷ء میں شہر ”جاں آسائے“ راحت افزائے دہلی میں رہتے تھے اور علوم معقول و منقول مفتی صدر الدین آزاد و دیگر اکابر علمائے دین سے حاصل کیے۔ خود لکھتے ہیں :

”اُن ایام میں بہت فضلاء مفتوان شباب دل میں یہ بھی ایک موج آئی کہ جناب
نجم الدولہ امیر الملک اسد اللہ خاں غالب حروف مرزا نوشہ، بلوی سے شعر میں اصلاح
یعنی شہزادی، تب ابتر عاشق و معشوق کے مضامین، ”چند سہا بنار“ کی طرز پر لکھنا

لے نور ایمان ص ۲ لے نور ایمان ص ۲ یزد مرزا حسن، محمود، پیر محمد ص ۲ لے نور ایمان ص ۲

تھا لیکن ان مضامین پر دل دادہ و فریفتہ نہ تھا۔ اسی وجہ سے ان کو بحفاظت تمام لکھ لکھ کر محفوظ رکھنا نہ تھا۔ چنانچہ اکثر غریبوں، ان وقتوں کی لکھی ہوئی ایسی منتشر کاپیاں کہ ان کا کہیں پتا نہیں بجز ایک قدر دان جن نے امراء خان بہادر شیخ بشیر الدین مرحوم (ان میں سے کچھ اشعار بحقیقت فراہم کیے ہیں)۔

مولانا عبدالمسیح بیدل کا یہ مجموعہ طراز سخن کے نام سے ۱۸۹۶ء میں محمود پریس محلہ اندر کوٹ میرٹھ سے شائع ہوا جو "غزلیات و عیدیات و دیگر منظومات" پر مشتمل ہے اور جس کے شروع میں مذکورہ صدر صاحب ذادہ بشیر الدین احمد صاحب خان بہادر حاجی عبدالکریم صاحب سی۔ آئی۔ اے میرٹھ کا دیباچہ بھی شامل ہے۔
مولانا عبدالمسیح بیدل "دام پر ضلع سہارن پور" کے رہنے والے تھے اور ان کا سلسلہ نسب حضرت ابی ایوب خزرجی انصاری صحابی رضی اللہ عنہ پر منتہی ہو کر نصر بن کنانہ سے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں ہیں، جاملتا ہے۔

شیخ بشیر الدین صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ بیدل نے ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳ء) میں مرزا غالب سے تلمذ حاصل کیا لیکن "مشاغل باطنی" میں اتنا انہماک تھا کہ کچھ عرصے کے بعد عاشقانہ مضامین کے بجائے "نعت گوئی کی جانب توجہ فرمائی۔۔۔۔۔ چنانچہ آپ کی مصنفہ کتابیں مثل نورایان، سلسبیل و راحت القلوب و بہار جنت و منظر الحق وغیرہ مشہور آفاق ہیں۔

دیباچہ نگار و مصنف نے لکھا ہے کہ :

"حضرت استاد کی توجہ ان جوامہ زایاں (عاشقانہ کلام) کے گنج کرنے کی جانب مائل نہ تھی۔ بڑی دقت کے ساتھ میں نے جہاں سے جہاں تھوڑا مل سکا فراہم کیا اور جزو جہاں بٹا کر لکھا گیا۔ دہلی کی غزلیوں کا مجموعہ بالکل نکل سکا۔ ۱۱۔ ایام ندر دہلی کے بعد جو غزلیں لکھی

۱۔ نورایان، ص ۲۔ ۲۔ طراز سخن، محمود پریس میرٹھ، ص ۱۰۳۔ ۳۔ طراز سخن، ص ۲۔ ۴۔ طراز سخن، ص ۲۔
۵۔ طراز سخن، ص ۳۔ بھیا ٹکس لکھنؤ کا بیان ہے کہ نعت گوئی کی طرف توجہ حضرت استاد ایش بہادر کی تیسرے سہ سے زیادہ کے بعد ہوئی۔

نہیں، وہ بیاض چری گئی ہے۔

خان بہادر شیخ بشیر الدین صاحب مرحوم نے جو کلام جمع کیا ہے وہ حضرت بیدل کی زندگی میں۔ اور اس مجموعے کے تیار کرنے میں ان لوگوں سے خاص طور پر مدد ملی ہے جن کو ان کا کلام یاد تھا۔ جو غزلیں ناقص ہیں ان کو اسی طرح رہنے دیا ہے۔

طراز سخن ۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ویسا ہے میں اس کا اعتراف ہے کہ اگرچہ موجودہ اردو شاعری "جدید تعلیم یافتہ طبائع" کے لیے "لطف انگیز" ہے لیکن بیدل کا کلام "عاشقانہ مضامین اور صنائعِ بدائع" دونوں اعتبار سے "سراٹھکوں پر جگہ دینے کے" لائق ہے۔

دیوان کی پہلی غزل کا مطلع ہے۔

بنایا عشق نے دل آئینہ اسرارِ جاناں کا

مرا حال پریشاں عکس ہے زلفِ پریشاں کا

ذیل میں بیدل کے منتخب اشعار "طراز سخن" سے دیے جاتے ہیں :

آسمان راہ پر نہیں آسا	باز یہ فتنہ گر نہیں آسا
کوئی حسرت نہیں نکلتی	مدعا کوئی بر نہیں آسا
ہم بھی پتھر کا دل بنالیں گے	گر وہ سنگیں جگر نہیں آسا

موتی بھر لائی ہے یہ چاندی کی کشتی میں بہاد

یا چنبیلی پر پڑی ہے اوس دانہ دانہ رات

اس کے رخ سے صبح کا دھوکا نہ کھا مرغا سحر

دیکھ زلفوں کو ابھی باقی ہے اسے دیوانہ رات

کٹ کے سراپنا گرا تو پائے قاتل پر گرا

تھا شہادت کے لیے یہ سجدہ شکرانہ رات

طراز سخن، ص ۳۰۔ شہ ابضا، ص ۳۳۔

رات بیدل نے غزل اک اور بھی لکھی ہے گرم
 شمع تھکی بے تاب جس پر صورت پروانہ رات

غم نہیں ہے کہ اضطراب نہیں
 دل دیا حق نے وہ کہ ہے بیتاب
 یہاں تو یہ نوبت کہ سانس گنتے ہیں
 اپنے عاشق کی بے کلی مت پوچھ
 شعلہ رو تیری گرم خوئی سے
 جان پر میری کیا عذاب نہیں
 آنکھ وہ وہی کہ جس کو خواب نہیں
 وہاں وہ غفلت کہ کچھ حساب نہیں
 دن کو آرام، شب کو خواب نہیں
 کون سا دل ہے جو کہا ب نہیں
 مختصر ہے یہ حال بیدل کا
 تن میں طالت، جگر میں تاب نہیں

جب اس بیت کی تر بھی نظر دیکھتے ہیں
 وہ آویں نہ آویں، مگر منتیں ہم
 وہ دیکھتے، نہ دیکھتے مگر ہم تو بیدل
 زمانہ کو زیر و زبر دیکھتے ہیں
 جو اپنی سی ہوتی ہیں کر دیکھتے ہیں
 اسی کو بس آنکھوں پہر دیکھتے ہیں

بیدل میں کبھی کوچہ و سب میں نہ جاتا
 لایا بھگے میرا دل بے تاب ادھر کو

گر مانگ یا مانگ نے دل اور جب گم کو
 وہ آئے، یہ آئے، ابھی غائب ہیں نظر سے
 کچھ شوق نہیں شعر و غزل سے بھگے بیدل
 چونی نے یا گوندہ مرے تارِ نظر کو
 خالم تری شوخی نے کیا مات مشہر کو
 لے آتی ہے فریادیں احباب ادھر کو

دل چاک چاک ہو گیا تیغ ادا کے ساتھ
 گر وصل بھی ہوا نہ ہوئیں بے حجابیاں
 ٹکڑے جگر کے اوڑھ گئے عشق جھا کے ساتھ
 وہ جلد گرا دل لہ گیا بندِ قبا کے ساتھ

جب باغ باغ ہو کے وہ بنتا ہے گلبدن جھڑتے ہیں بھول خندا ذندا کے ساتھ
 گزرا نہ میرے قتل سے سب سرچنگ مرے منت کے ساتھ بھرنے کے ساتھ، التھا کے ساتھ
 آجائے تو، تو جان پھرا جائے جسم میں مرکز بھی جی اونٹوں تیری آواز پا کے ساتھ
 دل کی جھٹ تلاش ہے پہلو میں دل کہاں
 بتیل تمہارا دل تو گیا دل دُبا کے ساتھ

اوتھاتے ہیں وہ رخ سے یوں نقاب آہستہ آہستہ
 چٹختے جیسے گلبن سے مابستاب آہستہ آہستہ
 نہیں کچھ ایک دوسرا غم کہ غم کے غم اوٹ دیں گے
 پلائے جاہیں ساقی شراب آہستہ آہستہ
 طراز سخن میں کچھ عیدیاں، پہیلیاں، قطعات تارخ اور اشعار فنا سی بھی
 شامل ہیں۔

بتیل کی تصانیف جو ہیں دستیاب ہو سکیں، ان کی تفصیل یہ ہے،

- ۱۔ نور ایمان۔ نعت شریف اور استخوان محفل میلاد میں۔ دیباچہ نثر میں ہے، باقی
 منظوم۔ مطبوعہ شرف المطابع میرٹھ۔ ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۳ء) تعداد صفحات ۷۲۔
- ۲۔ طراز سخن۔ (دیوان) محمود پریس میرٹھ۔ ۱۸۹۹ء۔ تعداد صفحات ۳۸۔
- ۳۔ ساسبیل فی مولد ہادی السبیل۔ قصیدہ نعتیہ۔ شرف المطابع میرٹھ۔
 ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۳ء) تعداد صفحات ۸

نوٹ:

اول میں وہ ہی ایک تھا، مولیٰ والی ایک تھا
 وہ ذی خبلی ایک تھا، وہ ستر معنی ایک تھا
 وہ گلچ ہستی ایک تھا، وہ کنز محفل ایک تھا
 پیدا نہ کوئی ایک تھا، جز ذات رب ذوالنہن

کب تھی یہ بھوروں کی ہچک، کب تھی یہ کلیوں کی چنک
نسر میں کب تھی یہ چپک، اچھا میں کب تھی یہ جھلک
لالہ میں کب تھی یہ دمک، کانٹے سے تھے گل برگ، تک

مردم تھے سب یک بیک، گل تھا نہ گلین نے چمن
یہ قصیدہ بڑے والہانہ فوق و شوق سے لکھا ہے اور اس میں قافیا و انکلا می کا پورا ثبوت
ہم پہنچایا ہے۔

۳۔ مثنوی نعمتیہ جوہر لطیف، فی میلاد الحنیف، مطبع قاضی میرٹھ ۱۳۲۷ھ۔ تعداد صفحات ۱۲۔
۵۔ حملہ باری۔ بیان لغات میں منظوم رسالہ، مطبع ہاشمی میرٹھ ۱۳۱۳ھ۔ تعداد
صفحات ۳۲۔ ابتدا :

سیل ہے رو اور نالا اسے دہر

ندمی ارغاب اور تالاب آب گیر

۶۔ مظہر الحق۔ ارکان اسلام کے بیان میں منظوم رسالہ۔ تعداد صفحات ۲۲
اور تعداد اشعار ۲۹۰۔ مطبع نامعلوم۔

۷۔ بہارِ جنت۔ (میلاد شریف) نشر اور نظم دونوں میں۔ مطبع محمدی کانپور ۱۳۱۰ھ۔
تعداد صفحات ۷۲۔

۸۔ راحة القلوب (نثر)۔ ذکریوں اور فضائلِ محفل میلاد میں۔ مطبع مجتہائی دہلی
۱۳۱۰ھ۔ تعداد صفحات ۹۲۔

۹۔ دافع الادویام فی محفل خیر الانام۔ مولود شریف کے جواز اور مولانا اسماعیل شہید
کی ترویج میں ۳۸ صفحے کا رسالہ جو نثر اور نظم میں لگا کر لکھا گیا ہے۔ زیادہ تر دلائل
شاد ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت مجدد الف ثانی ہی سے دیے گئے ہیں۔
مطبوعہ مطبع چشمہ فیض ۱۲۹۶ھ

۱۰۔ انوارِ ساطعہ در بیان مولود و فاتحہ۔ دہلی، علماء کے اعتراضات کا رد، سوال و
جواب کی شکل میں۔ مطبوعہ مطبع دارالعلوم میرٹھ ۱۳۰۲ھ۔ تعداد صفحات ۲۲۰۔

عبد اسمع بیدل شیخ الہی بخش ایس میرٹھ کے یہاں پر حیثیت معلم بارہ روپے ماہوار اور کھانے پر ملازم تھے۔ وہیں ۱۹۰۱ء میں انتقال فرمایا اور قبرستان موسوم شاہ ولایت میں دفن ہوئے۔ ان کے ایک صاحب زادے حکیم میاں محمد جوم، حکیم عبد المجید خاں دہلوی کے شاگرد اور میرٹھ کے مشہور طبیب تھے۔ معاصر بن بیدل میں بیان یہزدانی اور شوکت میرٹھی معروف ہیں۔ امیر مینائی سے بھی ان کے تعلقات تھے۔ بختیار محمد الدین کا بیان ہے کہ امیر کے خطوط بیدل کے نام جمع کیے گئے تھے جو سوہ اتفاق سے ضائع ہو گئے۔

معرکہ غالب و حامیانِ قتل

ایرانی ہندی نزاع کی روشنی میں

علاء الدین غلٹی کا زمانہ تاریخِ ہند کا ایک درخشاں باب ہے۔ منگولوں کی سفاکی و بے رحمی اور غلٹیوں کی قدردانی اور علمِ بروری کی وجہ سے ہندوستانِ علم و فضل کا مرکز بن گیا تھا اور ایشیا کی منفرد بنیاں یہیں اکٹریں ہو گئی تھیں۔ ملا عبد القادر بدایونی نے علاء الدین غلٹی کے دربار کے فقراءِ علما، فضلا اور شعرا کی طویل فہرست دی ہے۔ شبلی نے ان میں سے صرف ۶۰ اکابر کا ذکر کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے :

”لیکن امیر خسرو کے آفتابِ کمال نے ان تمام ستاروں کو بے نور کر دیا تھا اس وسیع مرتع میں صرف امیرِ موصوت کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔“

ادبیات میں ملکی اور غیر ملکی سوال کی ابتدا اور ایرانی ہندی نزاع کا آغاز بھی تقریباً اسی زمانے سے ہوتا ہے۔ تحسوس کی جامعیت اور اس کی شاعری اور زبانِ ادبی کا اعتراف تقریباً تمام ناقدین نے کیا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے :

”در حق او مرتبہ سخن گزاری ختم تمام است۔“

خسرو کو تمام اکابر نے ”طوطی بند“ مانا ہے :

عرفیؒ بہ روح خسرو ازیں پارسى مشکر دارم

کہ کام طوطی ہندوستان شود مشیریں

”ماہم بعض شعرا قومی تعصب کو نہیں چھپا سکے۔ جمید جو خسرو کا معاصر ہے لکھتا ہے :

غلط افتاد خسرو راز خامی

کہ سکبا پخت و دد دیگ نظامی

اس تعصب کی ایک وجہ یہ ہے کہ امیر خسرو نے بعض محاورے ایسے باندھے

ہیں جو اہل زبان کے یہاں نہیں ملتے۔ بعد میں یہ مسئلہ ”استعمال بند“ بہت بڑا نزاعی

سوال بن گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کبھی بھی مقامی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

مساخرین میں خان آرزو نے بھی اس استعمال بند کو جائز سمجھا۔

فیضی اور عرفیؒ کے اختلافات اور نوک جھونک کی بھی ایک وجہ یہی ایرانی

ہندی نزاع تھی۔ خانی خان نے ایک لطیف لکھا ہے کہ فیضی کو کتوں کا بڑا شوق تھا۔

سگ بچوں کے سونے کے پتے پڑے ہوئے تھے۔ عرفیؒ نے فیضی سے پوچھا :

”مخدوم زاد ہا بہ چہ اسم مرسوم اند؟“

فیضی نے کہا : ”بہ اسم عرفیؒ“

عرفیؒ نے برخستہ کہا : ”مبارک باشد“

ابو الفضل بھی عرفیؒ سے جلتا تھا۔ اکبر نامے میں لکھا ہے :

”درسے از سخن سرائی برو کشودہ بودند۔ ددخوردہ گریت و برپاستانیان

زبان طعن کشودہ غنچہ استعداد ننگفتہ پڑ مرو“

اکبر کے زمانے سے شاہد بھی کوئی ایرانی شاعر ایسا ہو جس کا کلام اعتراضات کا

ملہ تذکرۃ الشعرا (لاہور) ص ۱۵۸۔

ملہ لیکن فیضی نے اپنے مکتوبات میں عرفیؒ کی بڑی تعریف کی ہے۔

ہفت نہ بنا ہو۔ عرفی، ظہوری، قدسی، ازلالی سب ہی اس تیغ ہندی کے زخم خوردہ ہیں۔ یہی حال ایرانیوں کا تھا۔ حیدری تبریزی اکبر کا معاصر ہے اور اس نے ہندوستان کی داد و پیش سے بڑا فیض اٹھایا تھا لیکن جب وہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بالے میں لکھتا ہے تو اس انداز سے :

در کشور ہند شادی و غم معلوم آں جادل شاد و جان خرم معلوم
جائے کہ بیک رو پیہ آدم نہ خرمند آدم معلوم و قدر آدم معلوم
والہ ہروی لکھتا ہے :

در ہند کہ زاد گانشس تارک اوب اند

لبریز جہالت اند و فاضل لقب اند

حزب کا بھی یہی خیال ہے کہ ہندوستان فضل و کمال کے لینے زمین شور کا حکم رکھتا ہے اُسے تمام دار الخلافہ میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو رتبہ فضیلت لکھتا ہو۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ یہ نزاع صرف چند الفاظ کے استعمال کی نہیں تھی بلکہ اس ضمن میں اسایب و افکار بھی معرض بحث میں آ گئے تھے۔ عبد حاضر کے ایک ایرانی محقق نے اس ہندی اسکول کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے :

” افکار و احساسات اپانی اس سرزمین بہ تاثیر حوال سیاسی و طبیعی بر سیر و عوام
توہم و تخیل و مجسم انگاشتیں معانی باریک و لطیف کہ از عالم مادہ و جسم
دوری باشند متعالی است و در اداسے این تخیلات و توہمات و مسائل جزوہ
کہ بہ منزلہ اصل و انچہ جزاوست از فروغ آں می باشد تشبیہ و تمثالات است
پہ محسوسات و بالعکس دلس رعایت تناسب تام بین فہم و مشبہ بہ و بیان این
قبیل تشبیہات است بہ طریق استعارہ کہ نوع از ما بقہ در تشبیہ می باشد
نتیجہ این سبک بیان پیدایش معانی و مضامینے است بسیار غریب و دور
از ذہن کسانی کہ بہ افکار ہندی آشنا نیستند و بہترین نامے کہ بدیں طرز بیان

لے بیک بھٹی، روشن خاص۔

می توں داد "خیال ہندی" است کہ منتخب و مستعمل خود ہندی ہا است -
 نمونہ "خیال ہندی" این است کہ از مژدہ دل واریک شبت سوزن بہ سازند و
 آن را در خیاط خانہ دل بہ ریزند و خیاط گویہ را بہ گویند تا از کنگہ ہا و پارہاے
 دل براسے چشم پیرا من بہ دوزند و آن گاہ این معنی را در قالب الغنا
 فارسی بہ ریزند و پ گویند :

عزنی سے شبت سوزن بہ دلم زان مژدہ تا ریختہ اند
 گویہ از پارہ دل دوختہ پیرا من چشم
 و پ آں کہ بر سر مژگان بے غم خود خاک بہ ریزند و آن گاہ دست دل خود را
 بچیرند و بہ اتفاق او بہ گدائی روزنہ تا قدرے غم بہ دست آورند و در او اسے
 این معنی گویند :

خاک و گچہ بر سر مژگان بے غم می کنم
 دست دل می گیرم و در یوزہ غم می کنم " (نظیری)

علی اکبر شہابی خراسانی نے "روابط ادبی ایرانی و ہند" میں لکھا ہے کہ اس ہندی طرز
 نے بعض ایرانیوں کو بھی متاثر کیا لیکن ایران کے بلند طبع اور صاحب ذوق لوگوں نے
 اس تقلید کو کبھی پسند نہیں کیا ہے

شہابی نے "ہک ہندی" کی خصوصیات میں :

"خیال باقی مضامین باریک، افکار پیچ و پیچ، خیالات دور از طبیعت و

استعارات و تشبیہات غیر لطیف و مخصوص بہ ذوق و طبع ہندیان" اور

"مبالغہ و اغراق و بے مورد کاری و تکلفات غیر مستحسن" پر زیادہ زور دیا ہے۔

جہاں اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں ایرانی اثرات نمایاں ہو گئے تھے مجھے مغلوں کے

سے بہ حوالہ "روابط ادبی ایران و ہند"

سے روابط ادبی ایران و ہند (جلد اول) ص ۹۱

سے "مغلوں کے تعلقات ایران سے" از اسے رحیم اسلاک کلرل حیدر آباد دکن ۱۹۳۳ء

حزب کے ان اعتراضات کے خلاف خان آرزو نے آواز بلند کی اور اس سلسلے میں دو اہم کتابیں تصنیف کیں (۱) تنبیہ الغافلین (۲) احقاق الحق۔ لیکن صہبائی کو اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہے۔

تنبیہ الغافلین میں خان آرزو نے حزب کے دیوان چہارم پر اعتراضات کیے ہیں اور اس کے تقریباً چار سو اشعار کو غلط ٹھہرایا ہے۔ آرزو کی چند غلطیاں مطلع السعدین میں سباز کو نقل و درست نے بھی بیان کی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حزب کی یرانیست سے بہت مرعوب ہے۔

یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ حزب نے تنبیہ الغافلین کا جواب لکھا اور اس کا نام ”رجم الشیاطین“ رکھا۔ (نگارستان، ص ۲۱۴) لیکن یہ کتاب ناپید ہے اور جناب شوہر سہاسی اور تو اس کے وجود ہی کے منکر ہیں۔

۱۲۶۷ھ میں مولوی امام بخش صہبائی نے قول فیصل کے نام سے بظاہر ایک غیر جانب دارانہ کتاب لکھی لیکن اس کی بھی طرز و روش سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صہبائی، حزب کی طرف اسی پر تعلق ہوئے ہیں۔

صہبائی نے آرزو کے اعتراضات رد کیے ہیں اور حزب کی حمایت میں یرانی شعرا سے استناد کیا ہے بلکہ لیکن بعض جگہ وہ بھی سپرد اسنے پر مجبور ہو گئے ہیں :

”نظارہ گیان این نسخہ دریافتہ باشد کہ صہبائی بیچ مذاں کر جہت راجت بستہ
در ہر مقام قصیدہ آن دارد کہ توجیہ برائے کلام شیخ بہم رساند اما چہ کند
اشال این مقامات سپہری افکند“

اس مباحثے میں اس زمانے کے تمام اہل علم نے حصہ لیا ہے۔ مردم دیدہ کے منافع نے آرزو کے بیش تر اعتراضات غلط قرار دیے ہیں۔ مرزا علی طغٹ نے بھی

ص ۱۱۵۶ (۶۷۴۳) میں لکھی گئی۔

کے علاحدہ ہو۔ غلام سخن۔ (صہبائی) ص ۳۱۰۶۰۳۔

یہ قول فیصل، لکھنؤ ایڈیشن، ص ۱۳۵۔

ان کو درخود اعتنا نہیں بھیا۔ چنانچہ گلشنِ ہند میں لکھتے ہیں :

”۱۱۴۷ء میں کہ شیخ محمد علی حزیں علی الرحمتہ ایران سے شاد جہاں آباد میں تشریف لائے تو اس یگانہ روزگار کی ملاقات کو شاہ و گداسب آئے۔ سراج الدین علی خاں سے جس قدر اخلاق کہ مناسب ان کے حال کے پایا شیخ نے ادا فرمایا۔ لیکن اس بزرگ زادے نے نسبت غرور کی شیخ کی طرف منسوب کی اور ناحق اپنی طبیعت اُن سے محبوب کی، آرزوہ خاطر وہاں سے گھر آئے اور دیوانِ شیخ کا دیکھ کر بہت سے شعر ستیم ٹھہرائے۔ چنانچہ وہ سب اعتراضات جمع کر کے ایک رسالہ رکھا ہے اور نام اس کا تنبیہ العاقلین رکھا ہے۔ عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے۔ یہیں توصاتِ نزاع معلوم ہوتی ہے۔ جب باریک بینیوں کی نگاہ اس سے جا لڑتی ہے۔“

خان بہادر رضا علی وحشت کلکتوی نے ایک مضمون حزیں پر جولائی ۱۹۰۹ء کے مخزن میں لکھا تھا اور اس میں بھی یہ ثابت کیا تھا کہ آرزوہ کے بعض اعتراضات کسی طرح بھی قیاس نہیں ہو سکتے۔ خان آرزوہ نے بھی حدِ گروی ہے۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے اس نے خاقانی کو بھی اپنے اعتراضات کی تیغ سے زخمی کیا ہے اور یہ محض اس لیے کہ حزیں نے خاقانی کو سند کے طور پر پیش کیا تھا۔

غالباً خان آرزوہ نے تنبیہ العاقلین کے بعد ایک اور چھوٹا سا رسالہ حزیں کی مخالفت میں احقاقِ الحق کے نام سے لکھا ہے۔ مولانا صہبائی نے اس کا جواب اعلاءِ الحق کے نام سے دیا۔ لیکن تمام اعتراضات کا احاطہ نہیں کیا ہے۔ اعلاءِ الحق کا اب وجہ نہایت درشت اور تلخ ہے۔ خان آرزوہ کے متعلق لکھا ہے :

”مگر کہ سازِ حدِ صلا، غزلِ گستاخِ نفسِ سوزی ہائے گزاف، تہمتِ زود

امتیاز باطل و حق، صاحب نسخہ احقاق الحق ہے۔

ہم نے ادھر جو مرزا علی لطیف کا بیان نقل کیا ہے اس سے یہ خیال نہ پیدا ہونا چاہیے کہ خزین اور خان آرزو کی دشمنی صرف ذاتی اغراض کا نتیجہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ خزین کی کم نچاہی اور آرزو کی ناگواری کی سطح کے نیچے ایرانی ہند کی کشمکش کا رفرما تھی۔ تذکرہ حسین میں صاف لکھا ہے کہ خان آرزو کی مخالفت کا سبب یہ تھا کہ خزین فارسی زبان ہند کو خاطر میں نہیں لانا تھا۔

آرزو اور خزین کی ملاقات کا لطیفہ تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے نقل کیا ہے اور سب اس پر متفق ہیں کہ آرزو وہاں سے دل شکستہ لوٹے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ میر محمد افضل شامت اور آرزو نے خزین کے اس شعر پر اعتراض کیا،

ہر گہ کہ بہ یاد بہنت غنچہ نشستم

اندیشہ مرا سر بہ گریبان عدم داد

خزین ان "جاہلان ہند" کے اعتراض پر یہ کہہ کر چپ جو گیا کہ ان کو فارسی سے کیا واسطہ۔

خزین کے اخلاق و عادات میں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ اس کی آراؤ منشی اور خود پسندی ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ

لائق درج در زمانہ چونیست

خویشتر را ہی سپاس کنم

شاہ عالم اور شجاع الدولہ خود اس کے گھر آتے تھے اور ادب اور تعظیم بجالاتے تھے لیکن وہ ہندوستانی امیروں کو اس لائق نہیں سمجھتا تھا کہ ان کی ملازمت اختیار کرے۔

سے یکے از عقل زندان کہ بایست گرفت و امن عاطفت شاہ جلا بخش و وزیر

آن یکے می دیم ہند کہ در ہند بھوئے کام بے تہیت قدر مشناسان امیر

لے اطلاع الحق، نظامی پریس، ص ۷۹۔ صاحب نسخہ احقاق الحق سے شہ جوتا ہے کہ کبھانی آرزو کو احقاق الحق کا مصنف نہیں سمجھتے۔

محمد شاہ کے زمانے میں ایرانیوں کا زور بہت بڑھ گیا تھا۔ بادشاہ نے کئی مرتبہ
 حوزیوں کو قلعہ ابن وزارت پیش کیا لیکن اس نے انکار کر دیا۔
 ایسا آدمی خان آرزو کی قابلیت کا کب معترف ہو سکتا تھا۔ آزادوں نے ایک
 واقعہ نقل کیا ہے کہ کسی شخص نے آرزو کی یہ غزل نئے نئے نغمے کے ساتھ حوزیوں کے سامنے پڑھی۔
 نجل آرزو سے جواب دیا کہ یہ امین تنگی ظرف
 اشجہ در کیہ خود داشت بہ دریا بنخشید
 حوزیوں نے فوراً اصلاح کی۔

نجل از چشم جہانم کہ بہ یک ظرف تنک
 آن چہ در کار خود داشت بہ دریا بنخشید
 اور کہا: "امین بابا از کیستہ تا کاسہ و از تنگی و تنگی فرق نمی کند و باز خود را شاعر گوید۔"
 آزادوں نے ایک اور واقعہ نقل کیا ہے جو دل چسپی سے خالی نہیں۔ آرزو کے
 ایک عقیدت مند (یعنی شاہ مہمٹ اللہ) حوزیوں کے پاس پہنچے اور اپنا تعارف کرائے
 بغیر اس شعر کی درخواست کی۔

بجہ دارم کہ باشد از حیا مشاغلک ننگش
 خنجر پاسے او بوسد ز شوخی می پرور ننگش

حوزیوں نے کہا: "معلوم می شود کہ از کاسہ لیسان حرام زاوہ اکبر آباد است۔"
 آزاد کے اکثر بیانات غلط ہیں چنانچہ یہ روایت بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی، اس
 لیے کہ شاہ مہمٹ اللہ کا انتقال حوزیوں کے ہندوستان آنے سے قبل ہو چکا تھا
 لیکن ان قصوں سے حوزیوں اور آرزو کے تعلقات کی نوعیت عوام کی نظر دلوں میں
 ضرور معلوم ہو جاتی ہے۔

تذکرۃ الاحوال کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حوزیوں کو اپنی قابلیت اور
 ایرانی النسل ہونے کا غیر معمولی احساس تھا اور ان کی بہ دماغی کبھی دوسرے کے

لے بات قابل ذکر ہے کہ سیر المآثرین کے مصنف کو حوزیوں سے بڑا اٹھ تھا۔

محاسن کا اعتراف نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے بعد ایرانی ہندی نذاع، معرکہ حامیان قتل و غلاب کی صورت میں ظاہر ہوئی مرزا غالب اپنا رشتہ ادبی دودہ نجم سے جوڑتے تھے اور اس پر انھیں غیر معمولی فخر و ناز تھا۔ اس قسم کے اشعار ان کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں۔

غالب بہ گہر ز دودہ زاد ششم

زاں رو بصفائے دم تیغ ست دم

گہر از رایت شاہان عجم بر چسبند بمعوض خامہ گنجینہ فشاںم داوند

افسر از تارک ترکان پیشگی بروند بہ سخن ناصیہ منہر کیا نم داوند

ساقی چمن پیشگی و افراسیابم دانی کہ اصل گوہر از دودہ نجم است

میراث جم کسے بود اکون بہن پیار زاں ہیں رسد بہشت کی میراث آدم است

مرزا غالب، سراج الدین احمد کو لکھتے ہیں :

”ترک نژاد و نسب من بہ افراسیاب و پیشنگ می پیوند دہ

جو شخص دودہ نجم سے تعلق رکھتا ہو، وہ فارسی نویسان ہند کو کب حناظر میں

لا سکتا تھا۔

غالب نے قاطع برہان میں اپنے آپ کو اہل زبان میں شامل نہیں کیا :

”حاشا کہ خود از اہل زبان گیرم“ لیکن انھوں نے اپنی زبان دانی کی سلاقی اور

راستی پر اتنا زور دیا ہے کہ وہ صرف اہل زبان ہی کو سراوار ہو سکتا ہے یا اس شخص

کو جس کے ہجر میں ہزار غرور پوشیدہ ہوں۔

غالب کا دھوئی یہ ہے کہ زبان فارسی سے ان کو ”پیوند ازلی“ ہے اور ایک

”جاما سپ عہد“ اور ”بزرگچہر عصر“ کے سامنے انھوں نے زانوے ادب بھی تکیا تھا۔

لے فیض حیدر ہو پند فیر سید حسن عسکری، چند ہکا منقاد، شیخ علی حسین پر کچھ نئی روشنی، جو انھوں نے

۱۹۳۳ء میں انجمن ہندی کا نگرہیں الہ آباد میں چھاپا تھا اور جناب سید فراز خاں صاحب کا منقاد

شیخ محمد علی حسین پر۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :

" ملا عبد الصمد (ہرمزد - استاد غالب) غیر معمولی علم و استعداد کا شخص تھا۔

بلاشبہ مرزا غالب کی غیر معمولی فارسی مناسبت و رسوخ میں اس کی تعلیم کو بڑا

دخل ہوگا۔۔۔۔۔ عبد الصمد پر سنسکرت اور قدیم فارسی کے باہمی دشمنی کا راز

کھل چکا تھا۔ وہ نوں زبانوں کے مرادفات کی صحیح مثالیں اسے معلوم تھیں۔

سر ولیم جونس وغیرہ کے ابتدائی مباحث میں انھیں سے کام لیا گیا ہے۔

ملا عبد الصمد کا وجود تھا یا نہیں۔ یہ مسئلہ بڑا مباحثہ انگیز ہے لیکن خود غالب کا بیان

یہ ہے کہ اس کی مدد سے فارسی زبان کی حقیقت "دل نشین" اور "خاطر نشان" ہو گئی۔

لیکن اس معاملے میں انھوں نے اتنا غلو کیا کہ وہ اپنے آپ کو فارسی کا تنہا

دارث سمجھتے تھے اور ابتدا ہی سے ہندوستان کے متقدمین و متاخرین فارسی دانوں

میں سے ایک آدم کو چھوڑ کر باقی کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان کے غور کی

شاید اس سے بہتر مثال نہ مل سکے۔

ہر چند زمانہ جمیع جہاں است و ز جہاں نہ حال شاں بہ یک مژدہ است

کو دن ہمہ یک از یکے دگرے فرق خرمیسی و خرم جہاں است

معمر کا حامیان قلیل و غالب اسی ایرانی ہندی نزاع کی ایک گڑھی ہے۔

غالب کی قلیل دشمنی کو اگر اس پس منظر کے ساتھ دیکھا جائے تو ان کے انگار و امیال

اور موافقت و مخالفت کی بہت سی گتھیاں سلجھائی جاسکتی ہیں۔

اس ادبی جنگ کا بڑا سبب یہ ہوا کہ مرزا غالب اپنی پٹیشن کے

سلسلے میں ۱۸۴۲ء میں کلکتہ پہنچے۔ وہاں ایک مشاعرے میں غالب نے "گماں بر خیزد"

"میاں بر خیزد" غزل پڑھی۔ اس غزل کا ایک شعر ہے

۱۔ غالب "از غلام رسول ہرمزد" ۲۷۔

۲۔ دیکھیے "غالب کا ایک فرضی استاد" علی گڑھ میگزین "غالب نمبر" ۶۵۔

۳۔ ملاحظہ ہو "غالب نامہ" ص ۳۲۔

جزو از عالم و از ہمسہ عالم ہیشتم
ہم چو موسیٰ کہ بتاں را زیاں بر خیزد

اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ عالم مفرد ہے، ہمسہ کے ساتھ اس کا ربط بہ اجتہاد و قلیل درست نہیں ہے۔ کفایت خاں رئیس ہرات بھی شاعرے میں موجود تھے۔ انھوں نے "ہمسہ عالم" کی سند سعدی و حافظ کے کلام سے پیش کی لیکن اس سے مخالفین کا اطمینان نہیں ہوا۔
دوسرا اعتراض یہ کیا گیا کہ "ذریاں بر خیزد" صحیح نہیں ہے۔

تیسرا اعتراض "کدہ" کے استعمال پر تھا۔

غالب نے ان اعتراضات پر حل کر کہا کہ "میں فرید آباد کے کھتری بچے کا قول نہیں ناشاء کلکتہ میں غالب کے معترضین کی تعداد کافی تھی اور ان کی مخالفت کی ایک وجہ عبدالغفور نساخ نے یہ لکھی ہے کہ کلکتہ کے قیام میں غالب کا بلنا جلنا زیادہ تر ایرانیوں سے تھا۔ ان لوگوں نے ان کے کلام کی خاطر خواہ تعریف و توصیف کی۔ بلکہ کفایت خاں نے کلکتہ کے شاعروں کو چھوڑ کر صرف غالب ہی کی قدر افزائی کی۔ حاجی عبدالکریم اصفہانی کلکتہ کے بہت بڑے تاجر تھے۔ ان کے یہاں ایک ایرانی فاضل مرزا کو چک نام مقیم تھے۔ انھوں نے مجلس عام میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا: اس درجہ کا شاعر آج سرزمین ایران میں بھی کوئی نہیں۔ یہ باتیں مخالفین پر داشت نہیں کر سکتے تھے۔

غالب نے اس واقعہ کی حمد علی خاں صدر امین باندہ کو اس طرح اطلاع

دی ہے :

"از نوادر حالات ایں کہ سخن و زبان و نکتہ رسان ایں بقصد ہیں از ورود
خاکسار بزم سخن آراستہ بودند۔ در ہر ماہ شمس انگریزی روز یک مشنبہ
نخستین سخن گویاں در مدرسہ سرکار کمپنی فراہم شدندے، و غزلہا سے
ہندی و فارسی خواندندے ناگاہ گراں مایہ مرسے کہ از ہرات ہر سفارت

لے ملاحظہ ہو، غالب نامہ، ص ۳۲

لے غالب از ہر اشاعت سوم، ۱۲۳۱ ہ روایت مولانا ابوالکلام آزاد۔

رسیدہ است و رآں انجمن می رسد و اشعار مرآشمنودہ بہ بانگ بلند نامی ستاؤ
وہر کلام نادرہ گویان این قلم رو بہ تسم ہائے زیر لبی می فریاد چوں طبائع
بالذات مشغول خود نمائی است ہم گناں حمدی بر بند و کلانان انجمن و
فرزانگان فن برد بیت من اعتراض نادرست بر آوردہ آں را شہرت
می دہند

مرزا غالب نے اعتراض سے تنگ آکر ایک مثنوی "باد صاف" لکھی جس میں
معنی ہر دو این ہلکتے سے معذرت کی لیکن اس مصاحف میں بھی کئی بزرگ شریعے ہوئے تھے،
نکلتے ہیں، "نہ میں نے فقیل کی صحبت سے فیض حاصل کیا، نہ اس کی شہرت پر رشک ہے
نہ اسے بُرا کہتا ہوں لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ :

دامن اذکف کنم چگونہ رہا	طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روح روانی معنی را	آن ظہوری جہان معنی را
آں کہ طے کردہ ایں موافق را	چہ شناسد قتیل و واقف را
می شوم خویش را بہ صلح و صل	می سرانم نواس مدح قتیل
تا نہ ماند زمن و گر گلہ	رسد از پیروان دے صلہ
گر چہ ایرانیش نہ خواہم گفت	سعدی شانیش نہ خواہم گفت
لیک از من ہزار بار بہ است	از من دہم چمن ہزار بہ است
من کہد خاک داد سپہر بلند	خاک را کہد رسد بہ چرخ بلند

لے کیا تشریف غالب : ۱۷ (فول کشور ۱۳۸۷)۔ خطوط بنام عبدالغفور ستودہ اور عبدالرزاق ستا کر بھی
دیکھے جائیں، وعدہ بندی صفحات : ۱۷، ۱۸ (طبع علی گڑھ ۱۹۲۷)۔

۱۸ نیز ملاحظہ ہو "باد صاف" کی اولین روایت "از قاضی عبدالودود۔ بڑے تماشے کی بات یہ ہے کہ
غالب، فقیل کی بڑی تعریف کرتے ہیں، بھو ملیج ہی ہیں، مگر اس کی سند اس بنا پر کہ وہ ہندی ہے قبول
نہیں کرتے۔ مگر بتیل کی سند خود پیش کرتے ہیں۔ "شعر بیدل بجز تفضیل نیست" ۱۷ اولین روایت
میں نہیں، "بعد کو بدل جایا ہے۔

دست او صد چہ منے نہ بود
مہر و خورد روز نے نہ بود
مرجا ساز خوش بیانیے او
حتیٰ آشور نکستہ دانیے او
نقش آب حیات راماند
دو روانی فراست راماند
نثر و نقش بال طاوس است
انتخاب صراح و قاموس است
بادشاہے کہ در قلم رد حروف
کردہ ایجاد نکستہ ہائے شگرف
خام بندوے پارسی دانش
ہندی ایں سر خط فرمانش
این رقم ہا کہ ریخت کلاک خیال
بود سطرے ز نامہ اعمال
از من نارسائے بیچ مد اں
معذرت نامہ ایست لے یاراں
بو کہ آید ز عذر خواہی ما
رحم بر ما و بے گناہی ما
آشتی نامہ و داد پیام
ختم شد و اسلام والا کرام

غالب کی پریشانیوں میں پنشن کے مقدمے کو بڑا دخل حاصل ہے جس میں وہ ۶۱۸۲۴ سے ۶۱۸۴۴ تک اُلجھے رہے اور روپیہ ملنے کی امید میں قرض لیتے رہے۔ ۶۱۸۴۴ میں وہ "غلم رسوائی جاوید" یعنی قید فرنگ میں مبتلا ہو گئے۔ غرض خدر کے زمانے تک ان کو اتنا اطمینان نہ مل سکا کہ سمجھو یا ان تفصیل کے خلاف کوئی موثر قدم اٹھا سکیں۔

خدر کے زمانے میں مرزا غالب نے ایک روز ناچھ "دستجو" کے نام سے لکھا اس میں انھوں نے خالص فارسی میں "جہاں داران داد آسوز" دانش اندوز، نکو خو، نیکو نام" (انگریزوں) کی تباہی اور بربادی کا بھی ذکر کیا ہے اور یکم اگست ۱۸۵۸ء تک کے حالات جمع کیے ہیں۔ خدر کی خاندان نشین ہی کے زمانے میں انھوں نے "برہان قاطع" دیکھنا شروع کی اور اس کے اغلاط نوٹ کرتے رہے۔ غالب نے ان کو ایک علاحدہ رسالے کی صورت میں ۱۸۶۰ء میں مرتب کیا اور ۱۸۶۲ء میں چھپوایا۔

لے "قاطع برہان" کا دوسرا ایڈیشن 'ورث کلاویاتی' کے نام سے مع اضافہ مطالب و نوادہ ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔

‘قاطع برہان’ کی اشاعت نے ۱۸۲۵ء کے کاکتہ والے ہنگامے کو پھر تازہ کر دیا۔ قول غالب ”باسی کوڑھی میں اُبال آگیا“ اور ان کو آخر وقت تک اس مخالفت سے نجات نہیں ملی۔ ‘قاطع برہان’ ایسی ہنگامہ خیز کتاب تھی کہ کچھ عرصے کے لیے سادھی نصفاً مکتدہ بیگئی اور مخالفانہ لٹریچر کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(۱) ‘محقق قاطع’ (مولوی سعادت علی خاں)

(۲) ‘ساطع برہان’ (مرزا رحیم بیگ میرٹھی)

(۳) ‘قاطع القاطع’ (امین الدین پٹیلوی)

(۴) ‘مؤید برہان’ (آغا احمد علی)

(۵) ‘تبیخ تیز تر’

(۶) ‘شمشیر تیز تر’ (آغا احمد علی)

اس مخالفانہ لٹریچر کا جواب غالب کے دوستوں اور مؤیدوں کی طرف سے ان کتابوں کے ذریعے دیا گیا۔

(۱) ‘دافع برہان’ (مولوی جمعت علی)

(۲) ‘لطائف نصیبی’ (سیف الحق تیاچ) تہہ کا قیاس ہے کہ یہ کتاب غالب کی مکملی ہوئی ہے۔

(۳) ‘سوالات عبد المکریم’۔

(۴) ‘نامہ غالب’ از مرزا غالب

(۵) ‘تبیخ تیز’ مولانا غالب

(۶) ‘ہنگامہ دل آشوب’ وغیرہ۔

اس معارضے میں تلخی کا پیدائہ ہونا حیرت انگیز تھا۔ چنانچہ موافق و مخالف دونوں جماعتیں نا ملائم الفاظ پر آڑ آئیں اور طنز اور دشنام کے ترکش کا کوئی تیسرہ

نہ ‘غالب’ ۳۳۱ اشاعت سوم، نیز ملاحظہ ہو، علی گڑھ میگزین غالب لبر

لطائف نصیبی اور غالب از عبد الحمید ملک ۱۳۳

ایسا نہیں تھا جو انھوں نے صرف نہ کیا ہو۔

اس تمام لڑبجھ کو اس نظر سے جانچنا اور پرکھنا کہ غالب کے اعتراضات کہاں تک درست تھے، تحقیق کا ایک دلچسپ موضوع ہے اور اس کے لیے ایک علاحدہ فرصت درکار ہے۔ یہیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ ایرانی ہندی نزاع کے سلسلے میں اس کی کیا حیثیت اور اہمیت ہے۔

اگر جذبات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ غالب نے قاطع برہان لکھ کر علیٰ خدمت انجام دی اور اس ایرانی ہندی نزاع کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی جو اب تک تشنہ بحث تھے۔

رضا علی خاں ہدایت صاحب جمیع انصافانے فرہنگ انجمن آراءے ناصری میں غالب کے بعض اعتراضات کو صحیح مانا ہے۔ لیکن اس بحث، بحثی میں ذاتیات پر حملے ہونے لگے اور رفتہ رفتہ اس مباحثے کی علی اور تحقیقی حیثیت ختم ہو گئی۔

مرزا غالب شروع ہی سے قنیل و واقف کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور اپنے آپ کو عربی و ظہوری کا بہ مرتبہ سمجھتے تھے۔ گلۂ کے مشاعرے اور برہان قاطع کے ہنگامے نے غالب کے جذبات مخالفت میں شدت اور عصبیت پیدا کر دی۔ ان کی مخالفت کا یہ عالم تھا کہ جس سے بھی قنیل کا تعلق ملتا تھا، اس کے دشمن ہو جاتے تھے۔ مولوی غیاث الدین رام پوری مولف غیاث اللغات نے قنیل کی چار شریعت کا بھی حوالہ دیا ہے۔ غالب اس تعلق کو کب بروا ست کر سکتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

”غیاث الدین رام پوری ایک ملائے ملکیتی تھا۔ ناقل ناقل جس کا ماخذ

سے قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ ان مسائل کے بارے میں جو غالب اور حامیان برہان قاطع میں باہم النزاع ہیں، ہدایت نے جو کچھ لکھا ہے (فرہنگ نگار کی حیثیت سے) نزاع کی طرف اشارہ کیے بغیر۔ اور اس سے کسی قسم کی واقفیت کا اظہار کیے بغیر۔ وہ اسٹی فی صمد وہی ہے جو برہان میں ہے۔

اور مستند علیہ قنبل کا کلام ہوگا۔ اس کا فنِ لغت میں کیا فرجام ہوگا؟
مولوی غلام امام شہید چونکہ قنبل کے شاگرد تھے، اس لیے ان کے متعلق
ذکا حیدر آبادی کو لکھتے ہیں :

”مستقا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد قنبل وہاں کوں انا ولا غیر
بجرا ہے ہیں اور سخن ناشناسوں کو اپنا زور طبع دکھا رہے ہیں۔“

غالب ہر جگہ قنبل کو ہندی فارسی دانوں کا نمائندہ اور اپنے آپ کو فارسی و ایران
ایرانی نژاد کا علم بردار سمجھتے ہیں :

”یہ فارسی لار قنبل کی ہے۔“ ایک گھا و بچہ بہ روز سحر کچھ باتیں کرنے لگا۔
جنی اسرائیل اسے خدا بکھے۔“

”قنبل اساتذہٴ سلف کے کلام سے قطعاً نا آشنا ہی نہیں اس کے علم فارسی
کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے جو کو نواب سعادت علی خاں کے وقت میں
مالک مغربی کی طرف سے لکھنؤ میں آئے اور ہنگامہ آرا ہوئے۔ بیش تر
سادہ کشمیری یا کابل یا قندھاری و مکرانی۔ احیاناً عامہ اہل ایران میں سے
بھی کوئی ہو۔“ نا غلط ہے ایران میں سے بھی کوئی ہوگا۔ تقریر اور ہے تحریر
اور ہے۔ اگر تقریر بہ عینہ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ و طوطا اور شرف الدین
علی بزدی اور ملا حسین واعظ کا شغی اور طاہر وحید یہ سب نثر میں کیوں
خون جگر کھاتے۔ وہ سب اسی طرح کی نثر میں جو لال دیوالی سنگلہ قنبل
مستوفی نے بہ تقلید اہل ایران لکھی ہے، رقم و قرأتے بلکہ
صاحبِ عالم کو لکھتے ہیں :

”اصل فارسی کو اس کھتری بچہ قنبل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا، رہا سہا خیاات الدین۔“

لے غلطہ غالب، ص ۱۱۷۔

جسے اردو سے منقول : ۳۷۷ (لاہور، ۱۹۳۰ء)۔

جسے غلطہ غالب : (پشام قاضی عبد الجلیل)۔

جسے محمد ہندی : ۱۵۱ (طبع علی گڑھ : عہدہ غلطہ، سرود کے نام)۔

راپوری نے کھو دیا۔ غور کرو کہ وہ خزان نامشخص کیا کہتے ہیں، اور میں سخت و دروند کیا بکتا ہوں۔ وائٹنہ قلیل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے۔ . . . ان غلوں پر غصت کرو۔
 قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں :
 ” مگر پیرای قلیل کی ہے کہ وہ ایرانیوں کی تقریر کے موافق تحریر بنا رہا ہے۔
 لغت کو لکھتے ہیں :“

” لفظ ” بے پیر“ تورانی بچہ ہاے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے مرزا جمال اسیر علیہ الرحمہ مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال ہے کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادہ ایران ایسا لفظ لکھے۔“

مرزا غالب یہ سمجھتے تھے کہ زبان دانی، فارسی میری ازلی دست گاہ ہے اور یہ عطیہ خاص منجانب اللہ ہے اس لیے اگر کوئی غلطی ان کی دانست میں ایرانیوں سے بھی ہوئی ہے تو اس پر بھی تعجب کا اظہار کیا ہے۔ ایک اور موقع پر لغت کو لکھتے ہیں :
 ” فارسی میں مہدائیا ض سے مجھے وہ دست گاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط

۲۲۔ حمد ہندی :

۳۰۳۔ آردے معلی :

۱۹۔ ملاحم جے پر بہت قدیم ترکیب ہے۔ غافل، طالب، علی، صائب اور اشرف کے یہاں موجود ہے۔ (” غالب پر حشیت معق“ علی گڑھ سنگھن۔ غالب نمبر ۱۹۰)۔

۳۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو راز غلطی کے قائل نہیں تھے۔ حوین کے ایک مطلع کا ذکر کرتے ہوئے لغت کو لکھتے ہیں، ” حوین کے اس مطلع میں واقعی ایک ہنوز زاید اور بے ہودہ ہے۔ شمع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط محض ہے، یہ قسم سے، یہ عجیب ہے، اس کی پیروی کون کرے گا۔ حوین تو آدمی تھا، یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہوتا تو اس کو سند نہ ہوتا۔ (خطوط غالب، ص ۲۲)۔ وہ مطلع یہ ہے۔“

زنگ تازی آن نازیں سوار ہنوز زسبہ رمی ودا انگشت ونبہار ہنوز
 اسی خط میں لکھتے ہیں : ” نغمہ گفتن۔ اور گوش گفتن۔ ہم نہیں جانتے اگرچہ منشی ہر گز بال لغت اور دائرۃ الدین ظہری نے لکھا ہوتا۔ (خطوط غالب، ص ۲۲)

میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جو ہرے۔

”سنو میاں، میرے ہم وطن جو وادی فارسی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو خنل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں، جیسا وہ گھاگھس، اتو عبد الواسع، غلط، نملو، کو غلط کہتا ہے اور یہ انوکھا پشما قنیل ”صفوت کدہ“.... اور ”ہمد عالم“ کو غلط کہتا ہے، کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو ”یک زبان“ کو غلط کہوں گا۔ فارسی کی میسزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے، شرا احمد و شرا شکر علیہ۔

یہی وجہ ہے کہ غالب جندوستان کے سخنوروں میں سوائے خسرو کے اور کسی کو مسلم الثبوت نہیں سمجھتے تھے۔ سرور کو لکھتے ہیں :

”میں اہل زبان کا پیر و اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔ جب تک قدا یا متاخرین میں مثل صاحب و کلیم و امیر و جویں کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اس کو نظم و نثر میں نہیں لکھتا۔ ایک اور موقع پر فرماتے ہیں :

”کلام سعدی و جویں اور ان کے امثال و نظائر کا مستند علیہ ہے۔ نادر و اور واقعت اور قنیل وغیرہم کا۔“

غالب کی دلی

غالب کی دلی عالم میں انتخاب تھی۔ مرسولِ اسر کے الفاظ میں چین کے ساحل سے لے کر قسطنطنیہ تک کوئی شہر دید و دانش میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ صرف شہر نہیں ایک بڑی تہذیب کا مرکز اور علم و فن کا گہوارہ تھا۔ ہماری گنگا جمن تہذیب نے یہیں پرورش پائی تھی۔ معمولی بولیوں کو ادب کی کرسی نشینی کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ گسوائے اردو بھی سنوارے گئے تھے۔ حاتم سے لے کر حالی تک تمام اسالیب یہیں وجود میں آئے تھے یہیں تصوف نے انسانیت اور ردِ مندی کا ایک وسیع تر تصور پیش کیا تھا۔ علمِ حدیث نے یہیں ترقی کی علامتیں ملنے کی تھیں۔ علمِ طب نے یہیں میساقی کی تھی یہیں علم و ادب کی شمع کو اس شان سے فروزاں کیا گیا تھا۔ کہ دورِ دور تک تاریکیاں چھٹ گئیں۔ یہیں علمِ دین و شعر و سحر و سحر و سحر اور تاریخ و نجوم میں وہ میسار قائم کیے گئے کہ غرناطہ و بغداد کی یاد تازہ ہو گئی۔

سلطنتِ مغلیہ کی حیثیت ایک عظیم الشان درخت کی سی تھی جس کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بہادر شاہ اول کے زمانے سے لے کر

نادر شاہ کے چلے تک اس کے ٹپنے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے تو رہے لیکن اس کی جڑوں کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ مغلوں کی بربادی دراصل ۱۷۲۹ء سے شروع ہوتی ہے۔ نادر شاہ کے چلے نے ان کی کمر توڑ دی اور بقول حضرت شاہ ولی اللہ "از مملکت بجز ناسے باقی نماند" نادر شاہ نے ہندوستان کا وہ ستر لاکھ روپے کا شہر کوں پر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ بستیاں ویران اور بے چراغ ہو گئیں۔ ایک وقت تو ایسا آگیا تھا کہ مسلمانوں نے جو ہر کی رقم ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مال غنیمت بھی جو ہاتھ لگا اس کی مالیت اکٹھا کر ڈھیر سے کم نہ تھی۔ یہ دولت ایک دن کی نہیں، آٹھ بیڑیوں کی بیج کی ہوتی تھی۔ آئندہ رام مخلص کا خیال ہے کہ صرف جواہرات کی قیمت پچاس کروڑ سے زیادہ ہوگی۔ جان کا نقصان اس سے زیادہ تھا۔ ایرانی مورخین کا اندازہ ہے کہ اس ہنگامہ و آشوب میں تیس ہزار سے کم آدمی تہ تیغ نہ ہوئے ہوں گے۔

نادر شاہ کی غارت گری کے بعد لوٹ کھسوٹ کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ جاٹ مرچے۔ روہیلے اور فرنگی سب ہی ظلم و ستم پر آمادہ تھے۔

ہرجمن داس مصنف گلزار شجاعی نے جاٹ گردی کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی غارت گری سے ڈر کر دہلی کے باشندے اس طرح مارے مارے پھرتے تھے جیسے کوئی ٹونا ہوا جہاز ظالم موجوں کے تھپڑ سے کھا رہا ہو۔ مرہٹوں کے متعلق جگن ناتھ رام نے لکھا ہے کہ وہ دیہاتوں کو لوٹتے۔ لوگوں کے ہاتھ ناک، کان کاٹ لیتے اور خوب صورت عورتوں کو رسیوں میں باندھ کر لے جاتے۔ اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۱ء تک نو مرتبہ ہندوستان کو زبردستی بر کیا اور کوئی چیز خوردنی اور پوشیدنی نہیں چھوڑی چھین کر ا دیں۔ کسی کے گھر میں بدلو کشش ستر اور قوت یک روزہ بھی باقی نہیں رہی۔

ان طوفانوں میں عوام خس و خاشاک سے زیادہ مجبور اور بے دست و پا تھے ہرزبردست کے ٹھوڑے ان کے کھیتوں کو پا مال اور ہر جا برامیر کے سپاہی

ان کے گھروں کو بلے چراغ کو سکتے تھے۔ روزی کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔
 صبح کو لی تو خاشاک کی خبر نہیں۔ دست کار، صنایع، کسان، مزدور، وسیع و
 شریف سب ہی پریشان اور مضطرب تھے۔ کی زمین کے کم ہو جانے سے
 خود شاہی خاندان پر تین تین وقت کے فاقے گزرتے تھے اور ”سلاطین“ کی
 حالت فقیروں سے بھی بدتر تھی۔ نہ جسم بد کھڑا تھا اور نہ پیٹ میں روٹی۔
 مرزا رفیع سودا نے شہر آشوب میں لکھا ہے کہ اب نوکری نہیں ملتی۔ اگر
 گھوڑا جو قتل اور مزہرا ہے لے کر گئے بھی اور نوکری مل بھی گئی تو تنخواہ نہیں
 ملتی۔ افلاس کا یہ عالم ہے کہ علف و دانہ کی خاطر
 شمشیر جو گھر میں تو سپر بننے کے یاں ہے
 سودا کا شعر ہے۔

روپیہ کی شکل تو دیکھی نہیں خدا جانے
 کہ اس زمانے میں پھٹلے ہے وہ یا گول

سال سال بھر کی ملازمت کے بعد بھی ایک جہ تنخواہ کا وصول نہیں ہوتا۔
 سپاہیوں پر ہی موقوف نہیں ہر پینے شاعری و ملائی، خطاطی و صنایع سب
 کا یہی حال تھا۔ جاگیر داری اور اجارہ داری کی لغتوں نے آسائش اور اطمینان
 ختم کر دیا تھا۔ سیاسی انتشار اور اقتصادی بد حالی کے اس اندھیرے میں
 انگریز جن کے ہتھے صنعتی انقلاب تھا اور تاریخ کی بڑھتی ہوئی قوتیں تھیں۔
 اپنے قدم مضبوطی کے ساتھ جما رہے تھے۔ ہندوستان کا کوئی ہی سے ان
 کے مشینی انقلاب میں جان پڑی تھی۔ مصحفی نے لکھا ہے۔
 ہندوستان کی دولت و شہرت جو کچھ کہ تھی

کافر فرنگیوں نے تہہ بھر کیچنے لی

انگریزوں نے ۱۷۵۷ء میں بنگال پر اور ۱۷۵۹ء میں میسور پر قبضہ کر کے
 ہماری اقتصادی شہرگ کو کاٹ دیا تھا۔ اور وہ روز بروز اس ماسن و فاس

یعنی دہلی کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ بقول مصحفی

عہد بس قلعہ کے نیچے ہی تک ایک امن و امان ہے

چنانچہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ کلیک کی فوجیں فاتحانہ پرقم کے ساتھ دہلی تک پہنچ گئیں اور انگریزوں نے ضعیف العمر اور نابینا شاہ عالم کو جس کی حکومت بلامبالغہ دہلی سے پالم تک ماقی رہ گئی تھی مرہٹوں سے لے کر اپنے قبضہ میں کر لیا۔ سری اور جن جگہوں کے صلح نامے کی رو سے سندھیانے دواب کا سارا علاقہ مع آگرہ اور دہلی کے، انگریزوں کے سپرد کر دیا اور وہ تیموری جاہ و جلال جس کے آگے کبھی شانِ علم اور شوکتِ روم حقیر معلوم ہوتی تھی نیست و نابود ہو گیا اور اکبر شاہ ثانی کے متعلق یہ جملہ ضرب المثل بن گیا تھا۔

اکبر شاہ ثانی۔ چولھے آگ نہ گھرے پانی : دورانِ تیموریہ کے آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں مغلوں کی حکومت لفظاً اور معنیاً سمٹ کر قلعہ کی چہار دیواری تک رہ گئی تھی۔

لیکن دہلی شہنشاہی ہندوستان کا قلب و جگر اور ایک عظیم الشان تہذیب کی نشانی تھی۔ ہر طرف اسی کی تہذیب کا سک رواں تھا اور حضرت دہلی کی تعظیم و تکریم میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ۱۸۱۳ء بلکہ اس کے بعد بھی ہندوستان کے فرماں روا اور راجے مہاراجے اپنی تخت نشینی کو اس وقت تک قطعی نہیں سمجھتے تھے جب تک دہلی کے مجبور اور بے دست و پا بادشاہ کی مہر و توثیق ثبت نہ ہو جاتے بلکہ

ان انتشاری رجحانات سے یہ سمجھنا کہ اس زمانے کی تاریخ محض شور و شہس پندی یا عیش و کوشی کی داستان ہے یا اس زمانہ کا لاپ، رات اور زلف کی کہانی ہے، صحیح نہیں ہے۔ اجتماعی انحطاط اور سیاسی زوال کے

متعلق جو کچھ بھی کہا جائے لیکن ابھی انفرادی زوال مکمل نہیں ہوا اتحاد وقت کی ان عام مایوسیوں میں خیریت اور شجاعت۔ ارشاد و کرم۔ علم و فن۔ محبت اور رواداری کی حیرت انگیز مثال مل جاتی ہیں۔ غالب کی زندگی اور شاعری کو اسی سیاسی، معاشرتی اور نفسیاتی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ اس بڑے نقش میں بادشاہوں اور ایسروں کی غلط محنت یا رنگین مزاجی اتنی اہم نہیں جتنی غالب کی حکیمانہ زمانت اور شگفتہ متانت۔ تاریخی میں ایک محمد شاہ، ایک ابوالسحاق، ایک کوئی شانزدہم ہمیشہ ہوا ہے۔ اس کی بدچھائیں اور اس کا نعرہ دئے ہو فردا در میں خفا میں تحلیل ہو گیا ہے۔ لیکن جس چیز کو زوال نہیں وہ اس زوال پذیر معاشرہ میں غالب کا ثبات قدم، بچنے کا سلیقہ اور اقتدار عالیہ پر ایمانِ محکم ہے۔

شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ ”مخلوں کے جاہ و جلال کا اصل گہوارہ شاہ جہاں آباد تھا لیکن عجیب اتفاق ہے کہ نہ صرف ان فن تعمیر کا شاہکار اکبر آباد میں ہے بلکہ ان کے سب سے بڑے شاعر اور ان کی تہذیب و تمدن کے بہترین ترجمان کا مولد بھی وہی بلند حسن و شعر ہے۔“

مرزا اسد اللہ خاں غالب شب، ششم ماہ رجب ۱۲۱۳ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں بہو ند زمین ہوئے ان تہتر برس اور چار مہینے کی داستان ہمارے خطبات کا اصل موضوع ہے جس کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) غالب کی ولادت سے ۱۸۵۷ء کے انقلاب تک اور

(۲) ۱۸۵۷ء سے غالب کی وفات تک

غالب ارضِ تاج میں پیدا ہوئے جہاں محبت کی سب سے بڑی یادگار ایک

نواب مرہٹوں کی شکل میں موجود ہے۔ یہیں غالب کی حسیں اور ذہن مشاعری کی ابتدا ہوئی جس کا ہر نقش فریاد ہی ہے اور ہر شعر ہلکوں سے ڈھلکتا ہوا آنسو

تھ جوں اشک از سرخاں چکید نم بستگر

آگرہ، راجستھانی اور برج بھاشا کے سنگم پر واقع ہے۔ یہاں کی زبان نے اردو کی تشکیل میں جو کھڑی بولی کی نگہری ہوئی شکل ہے نمایاں حصہ لیا ہے۔ مرزا غالب کی والدہ اسی شہر آگرہ کے ایک معزز گھرانے کی تھیں۔ وہ پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ ریاست اللہ میں مارے گئے۔ یتیم ہونے کے بعد ان کی نگرانی ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے سپرد ہوئی جو اس وقت مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے گورنر یا صوبے دار تھے۔ جب لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر آگرہ پر قبضہ کر لیا تو یہ بے روزگار ہو گئے اور ان کی جگہ ایک انگریز کمشنر مقرر ہو گیا لیکن نواب احمد بخش خاں نے جن کی بہن مرزا نصر اللہ بیگ سے منسوب تھیں اور جن کے لارڈ لیک سے دوستانہ مراسم تھے ان کو کہہ سن کر انگریزی فوج میں چار سو سوار کا رسالہ دار مقرر کر دیا اور دو پر گھنے بھی ذات اور سوار کے خرچ کے لیے عنایت ہوئے لیکن ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ نصر اللہ بیگ خاں کا بھی انتقال ہو گیا۔ غالب نے یہ ابتدائی زمانہ اپنے چچا کے یہاں نہیں بلکہ نانا کے یہاں گزارا۔ مولانا حالی یادگار غالب میں لکھتے ہیں ”مرزا عبداللہ بیگ نے بطور خزانہ داماد کے اپنی تمام عمر سسرال میں بسر کی اور ان کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی ہے“

افسوس ہے کہ ہمیں غالب کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ ان کی تنہیاں بہت سودہ حال تھیں اور آگرہ میں انہیں ہر قسم کی آزدائی اور آسائش میسر نہ تھی۔ منشی شیونرائن کے خط میں انہوں نے اپنے شہر نج کھیلنے اور بلوان سنگھ (مشہور و معروف راجہ جیت سنگھ کے بیٹے)

کے ساتھ پتنگ لڑانے کا ذکر کیا ہے۔ اور مہر نیم روز میں اپنی اس بے ہودہ کوشش اور اوپاشی پر اظہار افسوس کیا ہے۔ آہ ز عمر کے گزشتہ ایس جنیں۔ تذکرہ سرور میں جو غالب کے قیام آگرہ کے بہت اہم ماخذ میں سے ہے لکھا ہے۔ اسد اللہ خاں اسد عرف مرزا نوشہ، مولہ کش اکبر آباد، جو اس قابل، یار ہاشم در خاطر متمکن غم ہائے عشق مجاز، تربیت یافتہ غم کدہ نیاز، آگرہ میں غالب کا ماحول شاہد و شعر و شراب کا تھا لیکن اس بہو و لعب کے باوجود انہوں نے مروجہ تعلیم بھی حاصل کی اور منطق و فلسفہ ہیئت اور طب میں اچھی خاصی دسترس بہم پہنچالی تھی۔ فارسی سے انہیں مناسبت اصلی تھی۔ تذکرہ گلشن بے خزاں میں لکھا ہے کہ انہوں نے شیخ معتمد اور نظیر اکبر آبادی سے بھی درس لیا تھا۔ مرزا غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے فارسی کے غوامض ملا عبد الصمد ہر مزے جو جانا سب عہد اور بزرگ عمر صرتھا، دو برس تک سیکھے لیکن مولانا حالی کے برخلاف قاضی عبد الودود کا خیال ہے کہ ملا عبد العمد فرضی نام ہے اور اس کا کوئی وجود خارجی نہیں تھا۔

مرزا غالب کی شبیہاں کتنی ہی آسودہ ہو اور ان کے ساتھ کتنا ہی اچھا سلوک کیوں نہ ہوا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کے والد کی حیثیت خانہ و اماد کی تھی اور اس کی وجہ سے گرد و پیش کی بہا و ثروت کو دیکھ کر ان کے دل میں ایک خاص باطنی غلش ضرور پیدا ہوتی ہوگی۔

تیرہ برس کی عمر میں مرزا غالب کی شادی ذوق کے شاگرد اور نواب احمد بخش خاں کے بھائی مرزا الہی بخش خاں معروف کی بیٹی سے ہو گئی اور اس طرح ان کا تعلق دہلی کے ایک ایسے ممتاز گھرانے سے قائم ہو گیا جو نہ صرف دولت مند تھا بلکہ شعر و ادب میں بھی ذمی حیثیت تھا۔

غالب پانچ چھ سال کی عمر سے دہلی آتے جاتے تھے لیکن چند روز مولد برس کی عمر میں مستقلاً دہلی میں اقامت گزیریں ہو گئے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ آنے جانے کا سلسلہ رہا۔ انھوں نے منشی شیونرائن کو جو خط اپنی پٹنگ بازی کے ذکر میں لکھا ہے وہ اٹھارہ انیس برس کی عمر کا واقعہ ہے۔ غالب کے چچا نعر اللہ خان کے انتقال کے بعد ان کی پیشینوا اب احمد بخش خاں کی جاگیر میں مشاغل ہو گئی تھی اور وہی ان کے ورثہ کے کفیل بھی تھے۔ دوسرے ان کی بھینسی سے غالب کی شادی ہو گئی تھی اس لیے وہ اگرچہ چھوڑ کر دہلی میں رہنے لگے تھے۔

غالب اس زمانے میں دہلی آئے جب دہلی میں نسبتاً امن چل رہا تھا۔ بقول مولانا حالی ”حسن اتفاق سے دارا خللاذ دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری اور شاہ جہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتی تھیں اور جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالب فرماتے ہیں :

ہندو انوکشش نفاستد سخنور کہ بود

بادور خلوت شاں اشک نشاں از دم شاں

مومن و نیر و صبیائی و علوی و انکھاء

حسرتی اشرف و آزدہ بود اعظم شاں

غالب سوختہ جاں گرچہ نیرزد بشمار

ہست در بزم سخن ہم نفس و ہمدہم شاں

مولانا حالی نے اس کے بعد لکھا ہے :

”اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی بار راقم کا دہلی جانا ہوا اس بارغ میں پتہ ہمارا شروع ہو گئی تھی۔ کچھ لوگ دہلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے مگر جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کا مجھ کو ہمیشہ فخر رہے گا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دہلی سے

بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھنا نظر نہیں آتا۔
سرمد نے تذکرہ اہل دہلی میں لکھا ہے:

”ہر ایک شخص ہزار ہزار خوبی کا مجموعہ اور لاکھ لاکھ ہنروں کا گلدستہ ہے۔“

مصر کے مشہور فاضل علامہ رشید رضا کو اعتراف کرنا پڑا اگر ہندی علماء علم حدیث کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو یہ علم ختم ہو چکا ہوتا۔ ان محدثین میں حضرت شاہ عبد العزیز کا نام نامی خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہے۔ ان کا یہ احسان معمولی نہیں ہے کہ انھوں نے انگریزی علوم سیکھنے کی ترغیب دی لیکن اسی کے ساتھ انگریزی تسلط کی مخالفت بھی کی اور اس پورے علاقے کو جولاڑہیک کی فتح یا ہاں کے بعد انگریزوں کے زیر نگین آگیا تھا دار الحرب قرار دیا یہ انھوں نے قومیت کا وسیع تر تصور پیش کیا جس میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کرشن جی عارف باللہ ہیں اور خدا کو بڑے مشورہ کے نام سے بھی یاد کیا جاسکتا ہے۔

مشتعل ہوئے۔ انگریزوں نے اپنے قدم دہلی میں جمالیے تھے۔ اس دہلی میں جس کے متعلق شاہ عبدالعزیز نے لکھا تھا کہ دوسرے شہر اور بلاذکنیزیں اور لونڈیاں ہیں اور دہلی مالک اور رانی - یہ موتی اور باقی سب کے سب بیسیاں۔“ دہلی مشتے پر بھی ہندوستان کا دل تھی اور اس کے علما کی راست روی اور غیرت قومی یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ دہلی پر انگریزوں کا تسلط ہو۔ ان کا فتویٰ جہاد نہ مرچٹوں کے خلاف تھا نہ سکھوں کے۔ حالانکہ ان دونوں طاقتوں کا اثر بہت دور تک پھیل گیا تھا۔ ۱۸۴۳ء میں رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد

انگریزوں نے پورے پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد جہادی تحریک کا رخ کلیتہً انگریزوں کے خلاف ہو گیا اور ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۳ء تک انگریزوں نے بیس دفعہ ۶۰ ہزار لشکر کی مدد سے جہادیوں کا مقابلہ کیا لیکن یہ تحریک پکلی نہیں جاسکی۔

دہلوی ملاکی تمام تر سعی یہ رہی کہ اسلام کو خارجی عناصر سے پاک کیا جائے لیکن وہ ہندوؤں سے اتحاد کرنے اور ان سے مدد لینے کے دل سے حامی تھے۔ ان کی رواداری اور اتحاد پسندی کا یہ اثر تھا کہ ہندو مہاجن ، ہندو راجہ - ہندو تحصیل دار - ہندو سامعین اور ہندو ترجمین سب ان کی خاموش تائید کرنے والوں میں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کو ہندوؤں کا تباہ و تاراج نہ ہوتا تو ان کی جہادی تحریک ہنگلی سے ساورنگ اور سرحد سے کونول تک نہ پھیلتی۔ اس لیے کہ مجاہدین کی تمام تر مدد ان ہی علاقوں سے گزر کر جاسکتی تھی۔

مرزا غالب کو نہ دہلیوں سے خصومت تھی اور نہ ان کے مخالفوں سے کچھ تعلق تھا۔ ان کے دوستوں میں ختم العلماء مولانا فضل حق خیر آبادی بھی تھے جنہوں نے غالب کو طرز ہیدل کی پیروی سے نجات دلائی۔ رام پور سے ان کا تعلق استوار کر دیا اور جو دہلوی تحریک کی مخالفت کے ساتھ انگریزی حکومت کے بھی سخت مخالف تھے، انہوں نے بہادر شاہ کے لیے دستور العمل سلطنت مرتب کیا تھا جس میں گاندکشی کی مخالفت تھی اور ہندو مسلم اتحاد پر زور تھا۔ ان کو حکم دوام جس ہوا اور ۱۸۶۱ء میں رنگون میں انتقال فرمایا۔

دہلوی تحریک مذہبی بھی تھی، سیاسی بھی، ادبی بھی — اس تحریک

نے وہ آزادی جرات اور بے باکی پیدا کی جو اس سے پہلے اردو ادب میں نہیں ملتی۔ دہلوی علما اور مرزا غالب کے راستے الگ تھے لیکن جس آزادی اور بے باکی سے ان علما نے مذہب و رسوم اور معاشرت میں تقلید کے خلاف جہاد کیا اور اصنام خیالی کو توڑا اسی آزادی سے مرزا غالب نے فن لغت اور فن شعر میں بڑے بڑے استادوں پر نکتہ چینی کی ہے اور اس بات پر زور دیا کہ اگلے جو کچھ کہ گئے ہیں وہ وہی اور الہام نہیں ہے اور نہ ہر نثرانی لکیر صراطِ مستقیم ہے۔

مولانا حالی اس بات پر متفق ہیں کہ سرسید میں بھی جو آزادی خیال اور جرات گفتار ہے اس کا سرچشمہ بھی دہلوی علما کی تحریروں اور تقریریں ہیں۔

غالب کے معاصر اور حضرت شاہ عبد العزیز کی مجالس و عطا کے حاشیہ نشین موئن کوچہ رقیب میں سر کے بل جانے کے لیے تیار ہیں اور شبِ وصل غیر کاٹنے کے لیے آمادہ لیکن جب وہ عام سطح سے بلند ہوتے ہیں تو اتنے کہ غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد کو اصل ایمان اور اپنی جان کو اس راہ میں صرف کر دینے کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے ہیں۔ مرزا غالب کو بھی حسرت رہی کہ وہ جہادی قافلوں میں شریک ہو سکتے اور ان کے دوش بدوش لڑ سکتے لیکن جس طرح ان کی مثنوی امتناعِ نظیر خاتم النبیین محض ایک ادبی لطیفہ ہے اسی طرح ممکن ہے کہ یہ آرزو بھی شاعرِ آزاد اسلوب سے زیادہ نہ ہو لیکن اس وقت بلاشبہ پوری دلی اس تحریک سے مسرور تھی اور ان دہلوی مقررین اور مصنفین کی خوش گفتاریوں کے آگے بہت سے چراغِ بدھم بج گئے تھے۔

شاہ عبد العزیز زبانِ دانی کے ماہر تھے۔ ان کے بھائی حضرت شاہ عبد القادر نے قرآنِ پاک کا اردو ترجمہ کیا اور اس میں ”زبانِ رینہ“ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف ”استمال“ کی ہے ”تا کہ عوام کو بے تکلف دریافت ہو“

ان علما کی کوششوں سے صاف اور سلیس زبان کا رواج ہوا جس کی بہترین شکل ہمیں ذوق و ظفر کی شاعری میں اور مرزا غالب کے خطوں اور

رقمیں میں ملتی ہے۔ نادر شاہ کا اپنی جیب دہلی آیا تو کہا جاتا ہے کہ محمد شاہ کے منشیوں نے تین برس اس سوچ میں صرف کر دیے تھے کہ شاہ ایران کو کیا القاب لکھا جائے۔ اس وقت القاب و آداب مقرر تھے اور تمام اوصاف اسم تفضیل کے سینے میں لکھے جاتے تھے لیکن جب نئی ضرورتوں کی صبح طلوع ہوئی تو یہ محکفات بھی ختم ہو گئے۔ غالب نے جدید تشریح کی طرح ڈالی اور سرسید آدم تشریف دید کہلائے۔

شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز دونوں خواجہ میر درد کے شاگرد تھے ان کا تصوف انسان دوستی کے آفاق گیر تصور پر مبنی ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں تو ہندوؤں کو موجد اور صاحب کتاب کہتے تھے یہ غالب کے یہاں بھی ”اصل چیز عقیدے سے وفاداری ہے۔ ملتیں انہم نہیں۔ ان کے منٹے سے جو ایمان بنتا ہے وہ اہم ہے۔ ان کی انسانیت کے دائرے میں دیر و حرم اور زنا و سب سے کافرق موجود نہیں ہے۔ یہی نے خطوں میں بھی ہے لکھتے ہیں: ”میں تو نبی آدم کو، مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور بھائی گنتا ہوں“

پروفیسر گب نے لکھا کہ جب کبھی تہذیب کو کوئی خطرہ لاحق ہوا ہے تو تصوف نے اس کو اتنی توانائی بخشی ہے کہ وہ مغلوب نہیں ہو سکی یہ انیسویں صدی کو عام طور پر زوال کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ سیاسی انحطاط سے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے لیکن ہمدی تہذیب کو ایسی گمن نہیں لگا تھا جہادی تحریک اور تصوف کے نئے مثبت رجحانات اس بات کے گواہ ہیں کہ اس وقت دلی اپنی روایات سے بگناہ اور روحانی اور اخلاقی ورثے سے بے بہرہ

نہیں تھی۔

ملکانی نے لکھا ہے کہ دہلی میں یہ شوق جہاد اتنا بڑھ گیا تھا کہ بہت سے لوگوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجی اور شہری ملازمتوں سے استعفیٰ دے دیے تھے اور اپنے گھروں سے سرکیف نکل کھڑے ہوئے۔ یوں بھی اس زمانے میں علما اور ثقافت کمپنی بہادر کی ملازمت کو "عالمی" اور عزت و افتخار سے گرا ہوا سمجھتے تھے۔ حضرت شاہ جہد العزیز، میر تقی میر، مرزا غالب اور مومن خاں مومن — کسی نے بھی انگریز کی ملازمت قبول نہیں کی۔ شاہ غلام علی خانقاہ والے تو کہتے تھے کہ ان سب کا وسیلہ معیشت مشتبہ ہے۔ سرسید نے نذر پیش کی تو خانقاہ کے تمام مشائخ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

مومن شاہ عبد القادر کے شاگرد اور مولانا سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔ ان کی مشادی دہلی کے نامور خاندان ارشاد و ہدایت یعنی خواجہ میر درد کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس لیے خوشامد اور تملتی سے پرہیز کرتے تھے اور قیصر کو کارہوس پیش گاہاں سمجھتے تھے۔ وہ رند غزل خواں بھی ہیں۔ اور جہاد کے علم بردار بھی۔ عروج شہید و حدیق بھی چاہتے ہیں اور محبوب کی نگاہ بے حجاب بھی۔ وہ مشنوی جہاد یہ بھی لکھتے ہیں اور مشنوی قول غنیمت بھی۔ یہ تضاد مومن ہی میں نہیں اس زمانے کی زندگی میں بھی تھا۔ وصل شاہد ان شیریں کے جو تعلق حرم میں پورے نہیں ہو سکتے تھے وہ دیوان خانے میں پورے ہوتے تھے۔ اس دور میں ایک مناجان، ایک درگاہانی منم۔ ایک رمبو، ایک صاحب جی برابر ملتی ہیں اور رندی و زہد میں وہ بیر نہیں تھا جو آج ہے۔

غالب مومن کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کے ایک شعر پر اپنا پورا دیوان نثار کرنے کو تیار تھے۔ ان کے مرنے پر غالب نے لکھا تھا ہے

کافر باشم اگر بہ مرگ مومن
چوں کعبہ سیدہ پلوشش نہا شم عمر
سر سید نے مومن کو "یگانہ جہاں" لکھا ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں حسرتی و
شیفۃ ان کے شاگردوں میں تھے۔ اور شیفۃ کے متعلق مولانا حالی کی
رائے ہے :

"لوگ ان کے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا مہیار جانتے تھے۔ ان
کے سکوت سے شاعر کا شعر خود اس کی فکر سے گر جاتا تھا اور ان کی
تحسین سے اس کی قدر بڑھ جاتی تھی پلہ
اور خود غالب کا فتویٰ ان کے متعلق یہ تھا کہ

غالب بہ فن گفتگو ناز و بد میں ارزشش کہ او

نوشست در دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

مومن کے انتقال کے بعد شیفۃ آردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مرزا غالب
سے مشورہ منہن کرتے رہے۔ دونوں میں بڑی دوستی اور محبت کے تعلقات
تھے۔ جب مرزا غالب ۱۸۴۷ء میں جوئے کے الزام میں قید ہوئے تھے تو
شیفۃ ہی نے ان کی مدد کی تھی۔ فرماتے ہیں :

خود جہاں فوں خورم از تم کہ بہ غم خوار می من

رحمت حق بہ لباس بشر آمد، گوئی

خواجہ بہت دیدیں شہر کہ از پرکشش نے

بایہ، خویشتم در نظر آمد، گوئی

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقوہم خوار من است

مگر میرم، پہ غم از مرگ، عزادار من است

فرد کا تعلق طبقہ سے ہے اور طبقہ کا دامن اس کے سماج سے بندھا ہوا ہے۔ غالب کی اچھائیوں اور کمزوریوں کو بھی اسی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ شاید وہ شیخ دے وقار سے ان کا تعلق کوئی بھی ڈھکی بات نہیں۔ وقار بازی کے الزام میں وہ ایک دفعہ نہیں دو دفعہ معذوب ہوئے۔ ۲۲ اگست ۱۸۴۱ء کے دہلی آندو اخبار میں لکھا ہے :

”سنا گیا ہے کہ ان دنوں تھانہ گزر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی وقار باز پکڑے گئے۔ خلل ہاشم مل خاں وغیرہ کے کہتے ہیں بڑا وقار ہوتا تھا۔ تھانہ دار قوم سے سید..... مرزا نوشہ ایک شاعر نامی اور رئیس زادہ۔ نواب شمس الدین خاں قایل ولیم فیروز صاحب کے قرابت قریب میں سے ہے..... اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علی قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے۔ زادا کریں تو چار مہینہ قید“

مئی ۱۸۴۱ء کا واقعہ اسیری اس کے بعد کا ہے۔ جس کے متعلق منشی کریم الدین نے لکھا ہے :

”ان ایام میں یعنی درمیان ۱۸۴۱ء کے، ایک حادثہ ان پر جانب ہمارے بڑا پڑا۔ جس کے سبب ان کو بہت دنوں لاحق سال ہوا۔ عمر ان کی اس میں قریب ساٹھ برس کی ہو گئی“

لیکن ان واقعات اسیری سے غالب کی ہشام از مفلت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ ان کی عظمت کے گوشے وہاں روشن ہوتے ہیں جہاں وہ شخصیت اور گرد و پیش سے گزر کر تاروں کو جھو لیتے ہیں اور کائنات کی دستوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ شیفہ بڑے خوش فکر شاعر تھے اور نقد شعر میں بھی امتیاز رکھتے تھے۔

ان کا تذکرہ گلشن بے خار میاں روی اور امجدال و توازن کے لیے مشہور ہے۔ ان کو ۱۸۵۷ء میں غیر معمولی مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کا قیمتی کتب خانہ جل گیا۔ مکانات کو آگ لگا دی گئی اور انگریزوں نے اعانت میرمانہ کے الزام میں ان کی جاگیر ضبط کر لی اور سات برس کی سزا دی۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں: ”مصلطفے خاں کا حال سننا ہو گا۔ خدا کرے مرافعوں میں جھوٹ جائے ورنہ جس ہفت سالہ کی تاب اس تازہ پروردہ میں کہاں“

شیفہ خوش قسمتی سے ایہل میں بری ہو گئے۔ غالب جن کی کوششوں سے شیفہ کو رہائی ملی تھی ان سے ملے میرٹھ گئے۔ جائیداد کی واکزادی میں بھی ان کا ہاتھ تھا۔ شیفہ صبر و رضا کی دولت خاص سے بہرہ مند تھے۔ مالک رام صاحب نے ان کے منہط و استقلال کے دو عجیب واقعات لکھے ہیں۔ جس زمانہ میں وہ قید میں تھے، پایادہ، بیڑی پہننے ایک سڑک سے گزر رہے تھے اس وقت آسمان کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے: ”تیری شان کریں کے قربان۔ اتنی ہی سزا دی، ورنہ میں تو اس سے بہت زیادہ کا مستحق تھا“

دوسرا واقعہ انھوں نے منش زکاء اللہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ شیفہ کو سرطان ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے عمل جراحی تجویز کیا۔ وہ آٹا اور ناقص گوشت کاٹ کاٹ کے الگ کر دیتا۔ دیکھنے والوں کے دل ہل جاتے لیکن ان کے ماتھے پر شکن تک نہ آتی۔ ایک دن بڑے صاحبزادے محمد علی خاں نے اختیار رونے لگے تو فرمایا ”اس جسم خاکی کے زوال پر رونا بڑی کم ہمتی ہے“

مفتی صدر الدین آزاد نے جو خود ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں چند درجہ چند مصائب کا شکار ہوئے تھے، اپنے مرثیہ دہلی میں شیفہ اور صہبائی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ثانی الذکر کے جسم کو توپ سے ہاندھ کر ان کے پرچے اڑا

دیے گئے تھے۔ آزدہ لکھتے ہیں :

روز و حشت بے صبرا کی طرف لاتی ہے
سر پہ اور جوش جنوں سنگ ہے اور بھاتی ہے
ہلکے سے ہوتا ہے جگر، جی رہی پہ بن آتی ہے
مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
میکوں کہ آزدہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

غالب اور سرسید کے دوست فاضل عصر مولانا امام بخش صہبائی دلی کالج
میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ بغاوت کے الزام میں ان کی جو دردناک موت
واقع ہوئی اس پر سفینہٴ رحمانی میں جو مرثیہ کے اشعار درج ہیں ان کو بڑھ کر
آج بھی درد کی ایک ٹیمیں پیدا ہو جاتی ہے :

ندائیم بجا رفت اُس نقش پاک	ملک بردیا ماند بردوئے خاک
ندائیم کے داد اور آصفین	دیا ماند چوں سایہ بر خاک تن
بخاکش نمودند اور استہاں	دیا مرتفع شد سوی آسماں
کے فاتح ہم برد خواندہ است	بطر گلانی برا فشانده است
الہی بیا مرزا مظلوم را	کلاہ شہیدی دہ بہ ملک بقا

صفتی صدر الدین آندہ فارسی اور آردو کے بلند پایہ شاعر اور عربی کے
زبردست عالم تھے۔ جرم بغاوت میں بقول غالب ”بہت دیر حوالات میں رہے۔
کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ رو بکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبانِ کورٹ نے
جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف۔ جائیداد ضبط۔ لیفٹیننٹ گورنر نے ازراہ
ترم نصف جائیداد و انکراشت کی“

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے ”مفتی صاحب کا دیوان خانہ دہلی کے مستنقہ افراد کا مجمع و مرکز تھا۔ جاڑا گرمی برسات کوئی موسم ہو لیکن شب کی مجلس کوئی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہر فن کے اکابر کو دہلی ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جاسکتا تھا۔ اگر کوئی نوجوان دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے فضل و کمال کو بیک مجلس دیکھ لے تو وہ سید عالم مفتی صاحب کے دیوان خانہ کا رخ کرتا۔“

اس زمانے میں اکثر مشاعرے ہوتے اور ان میں فارسی آزاد و غزلیں پڑھی جاتیں۔ غالب سب میں تو نہ جاتے لیکن جن مشاعروں کا انتظام نواب سید الدین خاں کرتے ان میں اصرار سے چلے جاتے۔ انھوں نے ایک قصیدہ عرفی کے طرز میں اور گریستن کی رویت اور جناب سید الشہداء کی معنیت میں لکھا تھا۔ اس مشاعرہ میں نہ مثنوی تھی اور نہ صہبائی۔ مرزا اکوٹا مل رہا کہ فارسی کا قصیدہ ہے پڑھیں نہ پڑھیں بلکہ ”دیرنہ گویاں را در دسرندیم“ اتفاق سے مفتی سید الدین آئندہ آگئے۔ غالب لکھتے ہیں: ”اگر آمدن حضرت آزاد وہ دل بخود بالیدوز مزمزہ دستور یافت“ مولانا حالی کا بیان ہے کہ مرزا کی پُردہ آواز سے مجلس مشاعرہ مجلس عزابن گئی اور جب تک قصیدہ پڑھا گیا لوگ برابر روتے رہے۔ اتفاق سے مینجہ برسنے لگا۔ مفتی صاحب نے فرمایا ”اے سماں ہم گریست“ یہ صحبتیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں درہم برہم ہو گئیں اور دہلی بھڑاؤں سے زیادہ دیکھادی ہو گئی ہے

پہن کے تخت پر جس دن شریک کا تہمل تھا
ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اک خود تھا، غل تھا
خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں

بتانا باخاں رور دیہاں فچہ یہاں گل تہا

جس زمانے میں مرزا غالب دہلی آئے ہیں یہاں انگریزی نظم و نسق قائم ہو چکا تھا اور گوشہ میں قفس کے کچھ آرام اور لطیفان بھی تھا۔ تہذیبی زندگی کا شیرازہ جو منتشر ہو گیا تھا، وہ ایک دفعہ پھر بند ہو گیا تھا اور اس کے نتیجے میں وہ رہ نما میسر آئے جنہوں نے عہد ہدیہ کی گزر گاہوں کو روشن کر دیا اور ہمیں ایک نئی سادہ زبان، ایک نیا ادب، نئے اصول نقد، ایک نیا نظام تعلیم اور مذہب اور تہذیب کی مدافعت کے نئے ہتھیار دیے۔ ہم نے مغرب کے آگے فوراً سپر نہیں ڈال دی بلکہ آویزش اور پیکار سے لے کر افہام و تفہیم اور مفاہمت و مصالحت کی تمام منزلیں طے کیں۔ یہ غلط فہمی عام ہے کہ انیسویں صدی میں ہندوستان علم و فن سے بیگانہ تھا اور اس پر زوال اور نکبت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن یہ پوری صداقت نہیں ہے۔ مگر نعل سلیم نے لکھا ہے:

” دنیا میں ایسی قومیں کم ہوں گی جن میں تعلیم اس قدر عام ہے جس قدر ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ یہاں سات سال کے درس کے بعد طالب علم کے دستا و فضیلت پانچویں جاتی سے ہے اور وہ اسی طرح سقراط، ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس اور بوعلی سینا کے متعلق گفتگو کر سکتا ہے جس طرح آکسفورڈ کا ایک طالب علم۔“

مرزا غالب کی دہلی میں علما میں شاہ عبد العزیز اور مولانا فضل حق خیر آبادی الجا میں حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں اور شعرا میں مومن و شفیقہ اور ذوق و ظفر موجود تھے اور ان میں سے ہر ایک کی حیثیت فرد کی نہیں ادارے کی تھی۔

غالب بھی اس عہد کے صاحب نظر دانشوروں میں تھے۔ وہ اگرہ کے خم کدہ نیاز سے نکل کر دلی آئے تو یہاں شاعروں سے معرکہ آرا ہوئے

انہوں نے ذوق کی ساسنی تحریک کو مانا لیکن اسے یکساں نظر بھی دی۔ کلکتہ گئے تو وہاں حایان قتیل سے برسرِ پیکار ہوئے اور اس ایرانی ہندی نزارع میں کود پڑے۔ جو فیضی اور عرفی شیخ علی حزیں اور خان آرتزو کے زمانے سے جاری تھی۔ مرزا نے اس میں بھی سرگرم حصہ لیا اور بعض ایرانیوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ پھر ان کی پنشن کا قصہ اٹھ کھڑا ہوا جس میں وہ پورے تیس برس تک الجے رہے۔ انہوں نے انگریزوں کی خدمت میں قید سے بچنے جو دراصل مظلوم عرصیاں ہیں اور ان کو اس زمانے کے مروجہ طریقوں ہی کی نظر سے دیکھنا چاہیے یہاں بھی سوالِ شنا گونی اور مدر گستری یا جینڈو سرپیچ اور مالائے مردارید سے زیادہ خاندانی حق اور وجاہت کا تھا جس کو وہ کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کا انتقال ہو گیا۔ ان کے مرنے کے بعد اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے۔ انگریزوں نے بہت کوشش کی کہ بادشاہ کے اعزاز و احترام میں کمی آجائے اور شاہی خاندان کو قلیب میں منتقل کر دیا جائے لیکن اکبر شاہ اپنے موروثی حقوق پر اڑے رہے۔ ۱۸۱۲ء میں جب گورنر جنرل کلکتہ سے دہلی آئے تو بادشاہ نے ان کو اپنے قریب کر سی دینے سے انکار کر دیا اور پھر آداب و نیاز کا یہ سلسلہ ہی منقطع ہو گیا۔

۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہو گیا اور ان کے بعد بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے۔ اس وقت ان کا عمر ساٹھ برس کی تھی لیکن وہ انگریزوں کی نظر میں بُری طرح کھٹکتے تھے۔ انہوں نے باوجود بے بسی اور پیرائے مالی کے بھی کچی شاہی عظمت کو قائم رکھا اور اس پر آج نہیں آنے دی۔ انہوں نے اس پر اصرار کیا کہ انگریز جو تاجدار ان کے حضور میں حاضر ہوں لیکن انگریز ان پر طرح طرح کے ظلم کرنے پر تھے اور ان کی معاشی حالت کو کمزور کرنے کے دوپے تھے۔ لارڈ ایلن براڈ

نے عیدین۔ نوروز اور سالگرہ کے موقع پر نذر پیش کرنا بند کر دی۔ ۱۸۴۸ء میں لارڈ ڈالہؤزی دہلی آیا اور مارے غرور کے بادشاہ کے حضور میں سلام کو حاضر نہیں ہوا۔ ۱۸۵۶ء میں زیر دستی یہ طے ہوا کہ بہادر شاہ ظفر کے بعد جو بھی تخت نشین ہو گا وہ لال قلعہ میں نہیں رہے گا۔ اس کو بادشاہ کے بجائے شہزادہ کے لقب سے یاد کیا جائے گا اور وہ چند رہ ہزار روپے ماہوار کی معمولی پنشن کے ساتھ قطب صاحب میں زندگی بسر کرے گا لیکن ایک ہی سال کے اندر بغاوت ہوئی وہاں دفتر احماد و خور دو گنا وراقصا ب برد

مرزا غالب کی شادی ذوق کے شاگرد نواب الہی بخش خاں معروف کی لڑکی سے ہوئی تھی جن کے تعلقات دہلی کے نامور شاعروں اور امیروں سے بہت گہرے تھے۔ غالب کو بھی ان مغللوں میں درخور حاصل ہوا اور وہ ان صحبتوں سے پوری طرح فیض یاب ہوئے۔ ذوق کا سکھ صرف معروف ہی کے یہاں نہیں بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی چل رہا تھا۔ غالب کے کلام میں جو سہل متنع کا رجحان اور زبان و بیان کے کشمیں کی طرف توجہ ملتی ہے وہ بھی اسی دبستان کا اثر ہے۔

۳۔ رجولانی ۱۸۵۰ء کو بہادر شاہ ظفر نے حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش پر نواب کو نجم الدولہ دیر الملک نظام جنگ کے خطابات دیے اور پچاس روپے ماہوار پر شاہانہ تنویر کی تاریخ لکھنے کی خدمت سپرد کی۔

۴۔ اکتوبر ۱۸۵۰ء کو استاد شہ خا قانی ہند ذوق کا انتقال ہو گیا چنانچہ بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی ان کے سپرد ہوئی لیکن ملک الشعراء یا اس طرح کا کوئی خطاب نہیں ملا۔ ظفر و غالب کے انداز و اسلوب میں بڑا فرق ہے اور وہ ان دونوں کے دیوانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔

بہادر شاہ کا سہارا بہت کمزور تھا۔ یہ چمراخ معلوم نہیں کب بجو جائے۔ ۱۸۵۲ء میں بہادر شاہ بیمار ہوئے۔ اس وقت غالب کو اپنے مستقبل کی

طرف سے فکر ہوئی اور انھوں نے منشی میر اسحاق کو لکھا:

”از شب مید خاقان رنجوراست۔ حالادیکر چرو نماید و بمن کر

در سایہ دیوارش غنودہ ام، چرودک

۱۸۵۷ء کو بغاوت شروع ہو گئی اور اس کے شعلوں نے دہلی اور

پورے اکناف ہند کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

مولانا غلام رسول جہڑ نے لکھا ہے ”یوں تو غالب کے الم نامرجبات

کا کوئی ورق بھی ایسا نہیں جس کے بین السطور کی آرایش میں دلی و جگر کھا

خون بے دریغ صرف نہ کیا گیا ہو لیکن اس جلیل القدر انسان کے اندوہ و

ماتم کا سب سے بڑھ کر دردِ ناک بابِ سلطنتِ تیموریہ کے زوال کا وہ خون

چمکاں واقعہ ہے جو عام مورخ ”عذر“ کے نام سے معروف ہے۔“ لے

غالب نے اس تہذیب کا مرثیہ بڑے بڑے دردِ الفاظ میں پیش کیا ہے

اور رمزی علامتوں کے چیرا یہ میں ساری خادجی حقیقتوں کو سولیا ہے۔

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط

دامان باغبان و کف گل فردوس ہے

لطفِ خرام ساقی دذوقِ صدا ئے جنگ

یہ جنت نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے اک کر تو بزم میں

لے دہ سرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے

دارغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی تھی سودہ بھی خاموش ہے

۱۸۵۷ء کی بغاوت پر اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ایک اچھا خاصہ کتب خانہ

تیار ہو سکتا ہے۔ لیکن اس دہلی کے حالات کا بہترین ماتخذ غالب کا روزنامہ
دستنبیو ان کے خطوط اور وہ اشعار ہیں جن میں ان کے دل کی تمام دھڑکنیں
سنی جاسکتی ہیں۔

غالب نے دستنبیو میں انسانی نقطہ نظر کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس نے انگریزوں
پر جو مظالم ہوئے ان کو بیان کیا ہے اور لکھا ہے: ”بیچ مشمت خاک کے نمائد کہ از
خون گل اند اماں از خواں زار نشاء“ لیکن اس کے ساتھ باقی دوستوں اور شہر کے
خودہ امیروں کی بھیلیوں سے بھی چشم پوشی نہیں کی۔ غالب کی مجبوریوں کے پیش
نظر اس روزنامے کو بین السطور میں بڑھنا چاہیے۔ اس لیے کہ غالب نے جابجا
منعت طرازی سے کام لیا ہے اور عبارت کی تہوں میں اپنے مطالب کو چھپایا ہے۔
دستنبیو کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں
عوام شریک تھے اور یہ صرف فوجیوں کا یہ پایا ہوا ہنگامہ و آشوب نہیں
تھا۔ عوام نے آخری وقت تک دلیرانہ اور مدافعتی جدوجہد کی اور اجیری دروازہ
اور ترکمان دروازہ یہ سب رزم گاہ میں تبدیل ہو گئے تھے۔ دہلی اب شہر
خوشاں میں تبدیل ہو گیا تھا اور پوری مسلمان آبادی شہر بدر گردی گئی تھی ”شہر از
مسلمانان حبی است شبانہ خانہ ملتے این مردم“ بے چراغ اور روزانہ، روزنہ و لولہ
بے دود“

دستنبیو لکھنے کا مقصد اپنی بے گناہی ثابت کرنا اور خلوت و خطاب اور پیش
کی درخواست کرنا تھا۔ پھر بھی اس کا ایک بڑا حصہ ان بحالیف کے بیان پر مشتمل
ہے جو فتح دہلی کے بعد مرزا غالب اور ان کے عزیزوں اور دوستوں کو پیش آئیں
اور جن کو انہوں نے بڑے پرسوز انداز میں قلم بند کیا ہے۔ غالب نے آئینہ کو
ایک خاص رخ سے پکڑا ہے اور پہلے دفعہ ہندوستانیوں کے مصائب کو
غیر ملکی حکمرانوں کے سامنے رکھا ہے۔

غالب اس قدر کے ہنگامہ میں مع زن و فرزند، قلم و خون کے مشناور

رہے اور انہوں نے دروازہ سے باہر قدم نہیں رکھا لیکن یہ اتنا بڑا انقلاب تھا کہ اس کے بیان کرنے کے لیے کوئی مناسب لفظ نہیں ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

”ہزار مل دوست مر گئے۔ کس کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں۔ جیوں تو کوئی غمخوار نہیں۔ مردوں تو کوئی عزادار نہیں!“

مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

”صاحب تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کیا واقعہ ہوا۔ وہ ایک جہنم تھا جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں مسالمت مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کیے۔ اس زمانے میں ایک بزدل تھے اور ہمارے دل دوست تھے منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر ان کا تخلص۔ نہ وہ زمانہ رہا۔ نہ وہ اشخاص۔ نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط۔ نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جہنم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جہنم کی بعینہ مثل پہلے جہنم کے ہے یعنی ایک خط میں نے منشی صاحب کو بھیجا اس کا جواب آیا۔ ایک خط تھا کہ تم بھی سو سو منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو اور میں جس شہر میں رہتا ہوں اس کا نام دلی اور اس محلے کا نام بلی ماراں کا محلہ لیکن ایک دوست، اس جہنم کے دوستوں سے نہیں پایا جاتا۔“

مرزا غالب نے اپنے خطوں میں بار بار اور بالآخر اپنی بے گناہی اور باغیوں سے بے تعلق ظاہر کی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

”اس تفتہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔“

لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ دہار میں حاضر

ہوتے تھے۔ انہوں نے بہادر شاہ کی خدمت میں سگد شاعر بھی پیش کیا تھا۔ اور فتح آگرہ کی خوشی میں ایک قصیدہ بھی بڑھا تھا۔ اس لیے ان کی بے گناہی کو بعض نئی شہادتوں کی روشنی میں قبول نہیں کیا جاسکتا۔ غالب نے حسین مرزا کو جون ۱۸۵۹ء کے خط میں لکھا ہے:

”یہاں ایک اخبار جو گوری شنکریا گوری دیال یا کوئی اور غدر کے دنوں میں بچتا تھا اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی تھی کہ تاریخ احمد اللہ علی غالب نے یہ سک کہہ کر گزرانا ہے

بہ زرد مسکے کشورستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی
مجھ سے عند الملاقات صاحب کشتی نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے
میں نے کہا کہ غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر۔ بادشاہ کے بیٹے
شاعر۔ خدا جانے کس نے کہا اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔
یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:

”میں نے سک کہہ نہیں۔ اور اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے
کو کہا یہ گناہ نہیں اور گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملک
مستقل کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ گور انداز کا بارود
بنانا اور توپیں لگانی اور ہنگ گھر اور میگزین کا لوٹا معاف ہو جائے
اور شاعر کے دو مصرع معاف نہ ہوں“

سوال یہ ہے کہ غالب کے وہ مصرعے کون سے تھے۔ تھے بھی یا نہیں۔ بہادر خیال
ہے کہ جو سکے غالب سے منسوب کیے گئے وہ درحقیقت ان کے نہیں تھے اور اس
معاملے میں ان کا اضطراب بجا تھا۔ لیکن انہوں نے سک بھی کہا تھا اور قصیدہ بھی
گزرا تھا۔ اس طرح باخبروں سے اخلاص کی بات بالکل نظر انداز کرنے کے
قابل نہیں ہے۔

غالب کا سک منشی جیون لال نے پیش کیا ہے۔ اس روز ناچہ کا انگریزی ترجمہ

ملکاف نے کیا تھا اور سنن فہم، عالم بالا کا حال یہ ہے کہ مکہ شعر کا ترجمہ اشرفی کیا ہے اور اس انگریزی ترجمہ کا اردو ترجمہ غدر کی صبح و شام میں موجود ہے لیکن ملکاف کا ترجمہ غلط ہے اور اردو ترجمہ غلط در غلط ہے جس اتفاق سے میں نے انگلستان کے قیام میں جیون لال کے اصل اردو روزنامہ سے استفادہ کیا ہے۔ اس میں انیسویں مئی ۱۸۵۷ء کے ذیل میں جیون لال نے لکھا ہے:

”در بار شاہی منعقد ہوا۔ مولوی ظہور علی تھانہ دار نے حاضر ہو کر ایک سکتہ جلوس دربارت تخت نشینی حضور گزرا تا۔ اس پر اور شاموں نے بھی سکے کہے۔“

تین سکے لکھنے کے بعد جیون لال نے مرزا غالب کا یہ شعر، مکہ شعر مرزا نوشہ کے عنوان سے پیش کیا ہے جو خود پکار کر یہ کہہ رہا ہے کہ اس کا مصنف غالب کے سوا اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

بمژر آفتاب و لقرہ ما

سکہ زد در جہاں بہادر شاہ

غالب نے ایک قصیدہ بھی، ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے زمانے میں اور فتح آگرہ کی خوشی کے موقع پر پیش کیا تھا۔ منشی جیون لال نے ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کے ذیل میں لکھا ہے:

”فتح آگرہ کے خروے سے سب بادشاہ اور اہل قلعہ خوش تھے

مرزا نوشہ اور کرم علی خاں نے ایک قصیدہ من تصنیف خود بادشاہ

کی طرف میں پڑھے۔“

جیون لال کے اس بیان کی تائید آگرہ کے اخبار عالم تاب سے بھی ہوتی ہے۔ اس میں لکھا ہے:

”مرزا نوشہ اور کرم علی خاں نے ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کے دن بہادر

شاہ کی تعریف میں قصیدے پڑھے۔“

اس سے صاف ظاہر ہے کہ غالب نے عوامی بغاوت کے زمانہ میں بہادر شاہ ظفر سے تعلقات منقطع نہیں کیے تھے۔ اس سے ان کی غیرت قومی اور بادشاہ کی ہر دل عزیز دوستوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

ملک میں ہر شخص بادشاہ کی غیر معمولی عزت اور احترام کرتا ہے اور ہندوستان کے تمام لوگ ان کو اپنا جائز آقا اور فرماں روا سمجھتے ہیں۔

اور واقعہ بھی یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے انگریزوں سے لڑائی ضرور لڑی تھی لیکن نہ کوئی بد عہدی کی تھی اور نہ کوئی غداری اور بغاوت کی تھی۔ اس نے تو صرف اس حق پر اصرار کیا تھا جو اس کو گیارہ پشتوں سے ملتا چلا آیا تھا۔ انگریزوں نے جو اس پر دلیوان خاص میں ۲۲ دن تک مقدمہ چلایا وہ بھی صریحاً بے انصافی تھی اور قہر و ہند میں جو مظالم کیے وہ بھی کسی طرح معاف نہیں کیے جاسکتے۔ رنگون میں قید تہائی تھی کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ جب بیماریاں بہت بڑھی تو حکیم کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ دفن کے بعد گوروں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے گھونڈوں سے قبر کو اس طرح زمین کے برابر کر دیں کہ نام و نشان تک باقی نہ رہے انہوں نے اس کی خود چن گئی کی نعمتی ہے۔

پس مرگ، قبر پر اسے نظر کوئی فاتحہ بھی کہاں پڑے

وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشان او سے ٹھوکر وں سے اڑا دیا

انگریزوں نے اس بات سے بھی ممانعت کر دی تھی کہ نہ کوئی قبر پر جائے اور نہ فاتحہ پڑے۔ مرحوم بادشاہ نے ایک شعر میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا تھا فرماتے ہیں:

کوئی آکے پھول چڑھائے کیوں کیوں آکے شمع جلائے کیوں
کوئی بہر فاتحہ آئے کیوں میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

غالب نے بہادر شاہ کی وفات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

"۱۷ نومبر ۱۸۵۷ء مطابق ۳۱ جمادی الاول سالی سال، جمعہ کے دن
ابوالفضل سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ اور قید جسم دونوں سے آزاد
ہو گئے۔ اٹا اٹلہ و اٹا ایلہ را جعون ۱۱"

کہنے کو یہ چند لفظ ہیں لیکن ان کے پیچھے درد ہی درد ہے۔ یاس ہی یاس ہے۔
دل تاجگر کہ ساحل دریا تے خوں ہے اب

بناوٹ کے زمانے میں جب جرنیل حکم نافذ تھا، غالب کے بھائی مرزا یوسف
کو انگریزوں نے گولی مار کے ہلاک کر دیا۔ ہمیں یہ اطلاع معین الدین حسن خاں کے
رو زناچے سے ملی ہے جو شہباز دہلی و یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہو چکا
ہے لیکن غالب نے اس کا ذکر نہیں کیا کہ وہ انگریزوں کی گولی سے ہلاک ہوئے۔
انہوں نے دستنبو میں صرف یہ لکھا ہے :

"۱۸ اکتوبر کو پیر کے دن وہ کم بخت دریا بن بھائی کے مرنے کی خوشخبری
لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتار راہ فنا (یعنی یوسف مرزا) پا پنا دن تیز
بخار میں مبتلا رہا اور آدمی رات کے قریب اس دنیا سے رخصت
ہو گیا۔ پانی۔ خصال۔ رومال۔ گورکن۔ اینٹ۔ چونے۔ گارے
وغیرہ کا ذکر چھوڑتے۔ یہ بتاتے کہیں کیسے جاؤں اور میت کو کہاں
لے جاؤں کس قبرستان میں سپرد خاک کروں۔ بازار میں اچھا
جرا۔ کسی قسم کا پتلا نہیں ملتا۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی
شہر میں تھے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مردوں کو دریا کنارے
لے جا کر جلا سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کی کیا مجال ہے کہ وہ دو تین
شخص ساتھ ساتھ راستے سے گزریں چہ جائے کہ میت کو شہر سے
باہر لے جائیں۔

پڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور اس کام کو انجام دینے

کے لیے تیار ہوئے۔ پٹیلے کے ایک سپاہی کو آگے کیا۔ میرے
دو نوکروں کو ساتھ لیا اور چل دیے۔ میت کو غسل دیا۔ دو تین
سفید چادریں اس گھر سے لے گئے۔ ان میں پیٹا اور اس
مبجد میں جو مکان کے برابر تھی۔ زمین کھودی۔ میت کو اس میں رکھا
اور اس گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے ۛ

۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر انگریزوں کا دوا رہ قبضہ ہو گیا لیکن یہ تاریخ
کی بڑی ہوناک ٹرائی تھی۔ اہل دہلی نے بڑی ہمت اور بہادری سے
ایک ایک اسلحے کے لیے جان دی۔ اور پورا شہر رزم گاہ میں تبدیل ہو گیا۔ ہڈیوں
نے لکھا ہے کہ ہم ان پدمشاخوں کا صحیح نشانہ مارتے اور توپوں کے تیز چلانے
میں مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ فتح کے بعد قتل عام شروع ہو گیا۔ ہر مسلمان کو باغی
قرار دیا گیا اور پوری آبادی شہر سے نکال دی گئی۔ یہ تجویز بھی تھی کہ سارے
شہر کو تہ خاک اور جامع مسجد کو سار کر دیا جائے تاکہ بقول اگرم مسلمانوں کو
حیرت ہو اور ان کے مذہب کی تہلیل ہو۔ یہ بھی تجویز تھی کہ پوری کی مسجد میں
فوج کو ٹھہرایا جائے اور زینت المساجد میں ایک بڑا تنور خانہ قائم کر دیا جائے۔
اس وقت غالب بد جو چراغ صبح کی مانند تھے کیا گزری ہوگی اس کا اندازہ تاہن
ہے۔ ایک دور ختم ہو گیا تھا اور دوسرا شروع ہوا تھا جو پہلے سے قطعی مختلف
اور معاندانہ تھا۔ غالب نے دستبنو میں لکھا ہے:-
”جن کو پھانسی دی گئی ہے ان کی تعداد فرشتہ موت ہی جانتا

ہے ۛ
مض پھانسی ہی نہیں دی گئی بلکہ بعضوں کی کھال کھینچ لی گئی، بعض کو زندہ بھلا
دیا گیا۔ بعض کو توپ کے ٹکڑے سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ بعض کو قید میں سڑا دیا
گیا۔ غرض انگریزوں کے انتقامی مظالم سے ”جان و مال و ناموس و مکان و
کیں و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے ۛ

نہ بازار نہ نہر

۵ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو چند گورے غالب کے مکان میں گھس آئے اور ان کو گرفتار کر کے کرنل براؤن کے سامنے لے گئے اس وقت کسی مسلمان کو شہر میں پہنچنے کی اجازت نہیں تھی۔ کرنل براؤن نے پوچھا ”تم مسلمان ہو؟ مرزا نے کہا۔ آدھا۔ فرمایا کیا مطلب؟ کہنے لگے شراب پیتا ہوں سو نہیں کھاتا۔“

یہ گرفتاری اور باز پرس معمولی بات نہیں تھی۔ دلی کے احکام، قضا و قدر کے احکام تھے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور نقش جاوہ نظر نہیں آتا تھا لیکن انہوں نے اس پہل صراط پر بھی۔ ظرافت کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہمیں ظلمت کے برداشت کرنے کا اہل بنایا۔ اس شکست اور اضطراب کے زمانے میں جب موج خون ہمارے سر سے گزر رہی تھی۔ انہوں نے ہمیں ایک حوصلہ اور ہمت عطا کی۔ یہ قضا مادی ترقیوں کے لیے سازگار نہیں تھی۔ اب سر لشکری کا موقع نہیں تھا۔ صرف سختی کا موقع تھا۔ وہ خود کہتے ہیں۔ ”آئینہ زد و دود و صحت معنی نمودن نیز کار نمایاں است۔ یہی وجہ ہے کہ توراخیوں کا علم ان کے قلم میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس قلم میں تلوار کی سی تیز روشنی اور برش ہے۔ اسی طرح ان کی ظرافت میں وہ شوخ اور ذہین ذہانت اور دیدہ وری ہے جو پیکر الفاظ میں روح بھونک دیتی ہے۔ ایک فلسفیانہ بے نیازی ہے۔ کلیت اور مرغیت نہیں۔“

خدر کے بعد غالب کے سارے ذرائع آمدنی مسدود ہو گئے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ۵۳ برس کا پنشن۔ تقریر اس کا بہ تجویز لارڈ ایک وہ مسئلہ گورنمنٹ۔ اور پھر نہ ملا ہے۔ نہ ملے گا۔ خیر احتمال ہے ملنے کا۔ علی کا بندہ ہوں۔ قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں قرض کی امید ہے۔ نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔

غالب نے مجبور ہو کر انگریز حکام کو پنشن کی بازیاں کے لیے لکھا۔ قیید سے نظم کے۔ عرضیاں بھیجیں اور ۱۸۶۰ء میں جاگزنشن کا کچھ روپیہ وصول بھی ہوا۔

رام پور کی سرکار نے بھی سو روپے ماہوار مقرر کر دیے تھے لیکن ان مواقع پر غالب کو خالصے خوش امداد خطوط لکھنے بڑے اور بندگی میں بھلائے ہونا مجب اور مجبور کے لیے شرمناک ہے۔

نذر کے بعد غالب ایک عرصہ تک پیشین خلعت و خطاب اور دربار و لمبر کے قیضے میں گرفتار رہے۔ جب ان الجبٹوں سے کچھ نجات ملی تو وہ مواردِ فساد خون میں مبتلا ہو گئے اور پھوڑوں کی کثرت سے سروغراں ہو گیا اور طاقت نے جواب دے دیا۔ ۵ جون ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

”۱۲۷۷ میں میرا نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا مگر اس تین برس میں ہر روز مرگ تو کا مزا چکھتا رہا ہوں۔۔۔۔۔ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طاقتِ نفس میں۔ کوئی شغل۔ کوئی اختلاط۔ کوئی جلسہ۔ کوئی مجمع۔ پسند نہیں کتاب سے نفرت۔ شعر سے نفرت۔ جسم سے نفرت۔ روح سے نفرت۔ جو کچھ لکھا ہے بے مبالغہ اور بیانِ واقع ہے۔

خرم اُس روز کڑیں منزلی ویراں بردم“

آخر عمر میں مرزا غالب کو مالی دشواریوں اور مسلسل بیماریوں نے زندہ در گور کر دیا تھا لیکن اس حیوانِ ظریف کی بدلتہ سنی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مرنے سے ایک دن پہلے نواب علاؤ الدین لودھانے حال پوچھا تھا۔ انھیں جواب دیا۔ ”میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہسپتالوں سے پوچھنا۔

دم واپسیں بر سر راہ ہے عزیز و اب اللہ ہی اللہ ہے“

غالب نے کبھی مصائب کے آگے ہار نہیں مانی اور وہ ہر حال میں پُر امید رہے۔ ان کی انسان دوستی۔ ان کی درد مندی۔ ان کی فراخ دلی۔ ان کی دیدہ وری۔ ان کی سنجیدہ نظرافت اور ان کی مشکفہ متانت ہماری تہذیب کا بہترین سرمایہ اور ان کی شخصیت ہمارے ادب کی سب سے دل کش اور قد آور

شغفیت ہے ۔

قمریاں یاس غلط کردہ خودی دارند
 درنہ یکجہ سرو دہیں بارغ پندام تو نیست
 ان کی یہ فزل لکھروں کا اختتام ہے عہد جدید کا اعلان اور صبح عید
 کی نوید ہے۔ انہوں نے نئے زمانے کی اور نئی قدروں کی اس وقت
 تائید کی اور صبح کی بشارت دی جب سرسید اور رام چند کو بھی اس کی
 ہمت نہیں ہوئی تھی۔ پہلے میں ان کے اشعار کو ٹکڑوں کا بعد میں ترجمہ
 کروں گا:

مژدہ صبح دہیں تیرہ شہانم دادند
 شمع کشتند وز خورشید نشانم دادند
 رخ کشتند و لبہ ہرزہ سرا بلبستند
 دل دلو دند و دو چشم جگر انم دادند
 سوخت آتش کہ ز آتش فسم بخشیدند
 دینت بت خازن زنا قوس فغانم دادند
 گہرا ز رایت مشاہان علم بر حیدند
 بومنی جامہ غنیمت فشانم دادند
 افسر از تارک ترکان پشنگی بردند
 یہ سخن نامیہ فر کیا نم دادند
 گو ہرا ز تاج گستند و بد افش بستند
 ہر چہ بردند بہ پیدایہ نہانم دادند

انہوں نے بجے اندھیری رات کے اندھیرے میں صبح ہونے
 کی خوش خبری دی۔ انہوں نے شمع بجھا دی اور سورج کے طلوع
 ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ جب آتش جل کر راکھ ہو گیا تو مجھے

آتش کی جگہ نفس یعنی زبان دی۔ اور جب بت غار گر گیا تو مجھے ناقوس کی جگہ آہ و فغاں دے دی۔ شاہانِ جم کے بھنڈوں کے موتی اتار لیے اور اس کے عوض میں مجھے غامہ گنیز فشاں عنایت کیا۔ اسی طرح ترکوں کے سر سے تاج ٹوٹ لیا اور تجھ کو شاعری میں اقبال کی مافی مرمت فرمایا۔ تاج میں سے موتی توڑ لیے ان کو علم و دانش میں جڑ دیا۔ یعنی جو کچھ علی الاعلان ٹوٹا تھا وہ مجھے چپکے سے دے دیا۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اراکہ کے لیے خصوصی رعایت۔ 20% اپنا کتب کو حسب ضرورت کمیشن دیا جائے گا۔

لہو لال کی قوی ایک ادبی سوانح



مصنف:
ایس۔ اے۔ خان
صفحات: 280
قیمت: 72 روپے

مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت



مصنف:
ایس۔ اے۔ خان
صفحات: 382
قیمت: 124 روپے

اردو کے ادبی معرکے



مصنف:
ڈاکٹر محمد رفیع
صفحات: 448
قیمت: 85 روپے

دستیو



مصنف:
پروفیسر خواجہ رفیع
صفحات: 88
قیمت: 12 روپے

اردو کی کہانی



مصنف:
سید اہتمام حسین
صفحات: 104
قیمت: 21 روپے

اردو ڈراموں کا انتخاب



مصنف:
پروفیسر محمد حسن
صفحات: 600
قیمت: 156 روپے



قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066